ہفت روزہ

الفتح

کراچی

آنے والے اسے آثارِ قدیمہ سمجھیں
یا کہ فرعون کے ایوان سے تعبیر کریں
ایک ہی رستہ ہے آزادیٔ انساں کے لئے
خون میں اپنے بہر طور نہانا ہوگا

۴ - ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۷۱ء



ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کی زیرِ تعمیر عمارت

شہیدِ اعظم

فارغ بخاری

زمانہ ہوگیا لیکن ہر اک محرم میں — حسینؑ تیرے الم میں زمانہ روتا ہے
کچھ ایسا درد سے معمور ہے فسانہ تیرا — کہ جو بھی سنتا ہے وہ بے قرار ہوتا ہے

ستم اٹھائے مگر بیعت یزید نہ کی — ثباتِ حق کے لئے گھر لٹا دیا تو نے
فسونِ ظلم و تعدی کو توڑنے کیلئے — لہو کا آخری قطرہ بہا دیا تو نے

تو ایک مقصدِ اعلیٰ کو لے کے اٹھا تھا — تیری شہادتِ عظمیٰ کوئی مذاق نہیں
جو اشک بن کے ٹپکتی ہے بے بسی پہ تیری — مجھے تو ایسی عقیدت سے اتفاق نہیں

یہ واقعہ ہے کہ جو مرتبہ ملا تجھ کو — کسی کے حصے میں وہ مرتبہ نہیں آیا
یہ حادثہ ہے تیرا نام لینے والوں سے — کسی نے بھی تیرا مسلک نہ اپنایا

تیرے فدائی، تیرے ہمنوا، تیرے پیرو
وفا پرست ہیں لیکن عمل شعار نہیں
یزیدیت پہ ہمیشہ جو لعن کرتے ہیں
یزیدِ وقت کی بیعت سے ان کو عار نہیں

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

جلد: — ۱ شمارہ: — ۴۲

٭

۴ - ۱۱ مارچ ۱۹۷۱ء

سرپرستِ اعلیٰ

شوکت صدیقی

٭

مدیر

ارشاد راؤ

٭

معاونین خصوصی

صفدر میر — منہاج برنا
ایم - کے - جنجوعہ

٭

مجلسِ ادارت

محمود شام - اشرف شاد - وہاب صدیقی

عکس: — الطاف رانا

بحرین، کویت	— ۶۰ فلس
دوبئی، قطر	— ۵، درہم
سعودی عرب	— ۱۵ قرش
انگلستان	— ۲ شلنگ، ۶ پنس

اداریہ

قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کے بعد

قومی اسمبلی کا افتتاحی اجلاس غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیا گیا

کیا صدر یحییٰ کے اس اقدام سے سیاسی بحران ختم ہو جائے گا یا اس میں شدت پیدا ہو جائے گی؟ اس کا جواب آنے والے واقعات بتا سکیں گے۔ فی الوقت کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہونے والا ہے۔ ماحول میں گھٹن ہے۔ بے چینی ہے، بے اعتمادی اور شک و شبہات کا دَور دورہ ہے۔ اس بحران کو ختم کرنے کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ عوامی لیگ آئندہ کیا راستہ اختیار کرتی ہے اس لئے کہ جہاں تک پیپلز پارٹی کا تعلق ہے ذوالفقار علی بھٹو ۲۸ فروری کو لاہور کے ایک جلسۂ عام میں قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کرانے کا مطالبہ کر چکے ہیں۔

اس وقت سارا جھگڑا دستور کا ہے۔ وہ دستور جو ابھی بنا نہیں۔ بننے والا ہے۔ کیا دستور ہمارا بنیادی مسئلہ ہے؟ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی نے اس کو بنیادی مسئلہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس سیاسی جھگڑے میں سب سے اہم فریق

بدل اشتراک

	فی پرچہ	سالانہ	ششماہی
مغربی پاکستان	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے	۶۰ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

خط و کتابت کے لئے

دفتر ہفت روزہ "الفتح"، ۸۰ ڈی - نرسری کمرشل ایریا - پی، ای، سی، ایچ، ایس - کراچی ۲۹

ایڈیٹر پبلشر ارشاد راؤ ۔ مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

مقام اشاعت: ۸۰ ڈی نرسری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس - کراچی ۲۹

نہ عوامی لیگ ہے ، نہ پیپلز پارٹی اور نہ موجودہ حکومت ۔وہ عوام اور صرف عوام ہیں ۔ درست ہے کہ عوام نے سیاسی جماعتوں کو اپنی نمائندگی کا حق دیا ہے ، لیکن یہ حق انھوں نے ملک کی سالمیت ، خوشحالی اور ترقی کے لئے دیا ہے ۔ عوام بھوک افلاس ، بے روزگاری اور استحصال سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں جب عوام خوشحال ہوتے ہیں تو ملک بھی خوش حال ہوتا ہے ۔ترقی کرتا ہے ، طاقتور بنتا ہے ۔ یکجہتی اور استحکام حاصل کرتا ہے ۔ عوام کا اس کے علاوہ اور کوئی مطالبہ نہیں ۔ دستور اُن کا بنیادی مسئلہ نہیں دستور مسائل حل کرنے کا ذریعہ ہے ، مسائل کا حل نہیں ۔ اس ملک نے اب تک تین دستور دیکھے ہیں ۔دستور بنتے رہے اور منسوخ ہوتے رہے ۔قومی اسمبلیاں بنتی رہیں اور ٹوٹتی رہیں ۔ لیکن عوام کے مسائل سلجھنے کی بجائے اُلجھتے گئے ۔

پچھلے عام انتخابات عوام کی انہی خواہشات کے آئینہ دار ہیں ۔ان انتخابات میں دو واضح رجحانات تھے' دائیں بازو کی جماعتوں نے عوامی مسائل کا حل "اسلامی نظام" تجویز کیا اور اس کی بنیاد پر پوری قوت کے ساتھ انتخابات میں حصّہ لیا ۔ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی نے اس موقف کو مسترد کر دیا ۔ انھوں نے اسلام کو فریق قرار نہیں دیا ۔ بلکہ اقتصادی بدحالی کو بنیادی مسئلہ بتایا اور اقتصادی بدحالی سے نجات حاصل کرنے کے لئے سوشلسٹ معیشت کو حل قرار دیا ۔ عوام نے عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کو بہت بڑی اکثریت سے کامیاب بنا کر سوشلسٹ معیشت کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا ۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ عوامی لیگ سوشلسٹ معیشت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنے چھ چھ نکات کو بنیاد بنانا چاہتی ہے ۔ پیپلز پارٹی سمجھتی ہے کہ چھ نکات سے ــــــــ ملک کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی ۔ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوکر کمزور پڑ جائے گا ۔ بھارت کی توسیع پسندی کا شکار ہو جائے گا ۔ بیرونی سامراج کے استحصال کی آماجگاہ بن جائے گا ۔

عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی دونوں اکثریتی جماعتیں ہیں ۔ دونوں ملک کے دونوں بازوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں ۔ دونوں باہمی تعاون اور اشتراک سے دستور بھی بنا سکتی ہیں ، اور نیک نیتی سے عوام کے مسائل بھی حل کر سکتی ہیں ۔ لیکن دونوں اپنے اپنے موقف سے ہٹنے کو تیار نہیں انھوں نے اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنا رکھا ہے ۔اس اختلاف کے نتیجے میں سیاسی بحران نے نازک صورت اختیار کر لی ہے ۔عوام بڑھتی ہوئی مہنگائی ، بے روزگاری اور معاشی استحصال کی چکی میں پس رہے ہیں ۔ ان کی نظر میں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی پر لگی ہیں کہ یہ دونوں اپنے وعدوں کے مطابق ان کو استحصال سے نجات دلائیں ۔ ان اذیت ناک حالات سے نجات دلائیں جنھوں نے زندگی کو ان کے لئے عذاب بنا دیا ہے ۔



قومی اسمبلی کے اجلاس کا التواء

یہ بھٹو کی فتح نہیں، ایک افسوسناک اعلان ہے

وقائع نویس

آج یکم مارچ ہے۔ دوپہر کو صدر یحییٰ قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔

اب بظاہر انتقالِ اقتدار کی منزل اور دور ہو گئی ہے۔ موجودہ عارضی حکومت کو نظم و نسق مدت تک سنبھالنا ہوگا۔ صدر یحییٰ نے اپنے اس اہم بیان میں کہا ہے کہ انہوں نے دل برداشتہ ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے۔

اسے بعض لوگ بھٹو کی فتح سمجھ کر پیش کریں گے۔ لیکن یہ واقعتہً ایک افسوسناک اور تشویشناک اعلان ہے۔ ایک روز پہلے مسٹر بھٹو نے لاہور کے ایک بہت بڑے جلسۂ عام سے خطاب کر کے اپنی تین شرائط پیش کی تھیں کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا جائے یا بارہ روز میں آئین سازی کی مقررہ مدت کی پابندی ختم کر دی جائے۔ تیسرے شیخ مجیب الرحمٰن چھ میں سے تین نکات کرنسی ٹیکسیشن اور بیرونی تجارت پر قومی اسمبلی کے اجلاس سے پہلے مفاہمت کی یقین دہانی کروائیں۔ مسٹر بھٹو نے سب سے زیادہ زور اس بات پہ دیا تھا۔ غیر ملکی تجارت صوبوں کے سپرد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر صوبے میں مختلف غیر ملکی طاقتیں موجود ہوں گی جو ان کے ساتھ الگ الگ معاملات طے کر رہی ہونگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وزیر خارجہ کے پاس اس کے سوا اور کیا باقی رہ جائے گا کہ وہ محض غیر ملکی سفیروں کا خیر مقدم کرتا ہے۔

بھٹو اور مجیب کی یہ اعصابی جنگ ایک عرصے سے جاری ہے۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے نمائندے مل کر بھی قانونی طور پر ایک صوبے مشرقی پاکستان کے نمائندوں کی نسبت اقلیت میں رہتے ہیں۔ مجیب الرحمٰن صاحب کا یہ تاثر کہ وہ اکثریت میں ہیں۔ اور وہ اکثریت چھ نکات کی بنیاد پہ منتخب ہوئی ہے۔ اپنی جگہ مگر یہ تمام نمائندے ہیں ایک ہی صوبے کے اور مغربی پاکستان کے صوبوں میں جو نمائندے چھ نکاتی پروگرام لے کر کھڑے ہوئے۔ ان کی ضمانتیں ضبط ہوئیں۔ اس وقت موجودہ سیاسی بحران اسی عدم توازن کا ہی نتیجہ ہے۔ ورنہ مسائل مشرقی پاکستان اور سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان کے ایک سے ہیں۔ عوام نے جن نمائندوں کو منتخب کیا اس کا بنیادی مقصد بھی استحصال کا خاتمہ تھا۔ لیکن اب ہفتوں کی کوششوں کے بعد بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی ہے۔ ۲۸ فروری کو لاہور میں مسٹر بھٹو کے جلسے تک کراچی ڈھاکہ فون کی لائنیں کھڑکتی رہیں۔ لیکن حالات انتہائی افسوسناک رہے اور کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور جب مسٹر بھٹو کی تقریر آگئی تو ڈھاکہ میں سخت ردعمل ہوا۔ مجیب بھاگم بھاگ گورنر احسن سے ملے۔

صدر یحییٰ کے اعلان کے بعد ڈھاکہ میں شدید ردعمل ہوا ہے۔ شیخ صاحب نے مزاحمت کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس کا جو نتیجہ ہوگا اور عوام جس طرح متاثر ہوں گے وہ انتہائی افسوسناک ہوگا۔

موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل حقائق پر غور کرنا ضروری ہے۔

۱۔ شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات پہ کیوں ڈٹے ہوئے ہیں؟

۲۔ پیپلز پارٹی چھ نکات کو کیوں تسلیم نہیں کرتی

۳۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کے عوام کیا چاہتے ہیں اور ان کے

اقتصادی بحران کا کیا ہوگا؟

شیخ مجیب الرحمٰن چھ نکات کو پاکستان کی بقاء کا نسخہ قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ حالات کو ایک خاص انداز سے دیکھنے کا ڈھنگ ہے۔ حالانکہ غیر ملکی تجارت اور صوبوں کے سپرد کر دینے سے تمام صوبوں کے اپنے اپنے طور پر غیر ممالک سے تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ ملک میں بیک وقت پانچ خارجہ پالیسیاں چل رہی ہوں گی۔ اس کے لئے محض یہی مثال کافی ہے کہ مشرقی پاکستان بھارت سے تجارت کی بحالی کے حق میں ہے۔ مگر صوبہ پنجاب بھارت سے تجارتی تعلقات بحال نہیں کرنا چاہتا۔ کسی وقت اگر پنجاب کی سرحد پر بھارت دباؤ ڈالنا چاہتا ہے تو اس وقت مشرقی پاکستان کیسے پنجاب کا ساتھ دے گا۔ ابھی چھ نکاتی آئین اگرچہ وجود میں بھی نہیں آیا۔ لیکن مشرقی پاکستان کے تاجروں نے اپنے تجارتی امکانات کا جائزہ اور غیر ممالک سے بات کرنا بھی شروع کر دی ہے۔ ڈھاکہ کے ایوان صنعت و تجارت میں شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ کہہ کر مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کو مشرقی پاکستان سے نہیں نکالا جائے گا۔ اس بات کی توثیق کر دی ہے کہ مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کو ان کی حمایت حاصل ہے۔ پھر وہ کن مغربی پاکستان کے صنعت کاروں کو ان کی حمایت حاصل ہے۔ پھر وہ کن مغربی پاکستانیوں پر مشرقی پاکستانی عوام کے استحصال کا الزام لگاتے ہیں یہی صنعت کار ہی تو مشرقی پاکستانی مزدوروں پر ظلم و تشدد کرتے رہے ہیں۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستانی عوام سے دور رکھنے کے لئے جو طاقتیں سازشیں کر رہی ہیں۔ ان میں امریکہ سر فہرست ہے۔ اس کے بعد سرمایہ دار اور اس کے بعد رجعت پسند سیاسی گروپ۔ امریکی قونصل سے ملاقاتوں کی تفصیل گزشتہ شمارے میں دی جا چکی ہے۔ اب امریکی سفیر نے شیخ صاحب سے ۴۵ منٹ کی بات چیت کی۔ یہ امریکہ کی دیرینہ خواہش ہے کہ مشرقی پاکستان کو آئینی طور پر علیحدہ کیا جائے وہاں براہ راست سرمایہ کاری اور مشرقی پاکستان

میں افواج میں اضافے کے بعد مشرقی پاکستان اس قابل ہو جائے گا کہ اسے خود مختار قرار دیا جائے موجودہ حالت میں مشرقی پاکستان علیحدگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ مغربی پاکستان کے صوبوں میں سے بلوچستان مشرقی پاکستان کا ہم نوا ہے۔ کیونکہ وہاں روس نے براہ راست سرمایہ کاری کی حامی بھری ہے۔ اور بلوچستان کے بعض سرمایہ دار اور صنعت کار اس وقت مکران میں آئل ریفائنری کی تنصیب کے بعد دولت کی ریل پیل کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ بلوچستان کے بعض رہنماؤں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ ہم نے ۲۳ سال میں بلوچستان کو ایک صوبہ بنا لیا ہے اب کے برس میں اسے ایک ملک بنا دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ کشمیر ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ کشمیر اگر ہمارے ساتھ شامل بھی ہو گیا تو اس سے بلوچستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ جب سوچنے کا یہ انداز ہو تو کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔ امریکی اور روسی سامراج اسی وقت "وحدت پاکستان" کے درپے ہیں۔

یہ الزام لگانے والے کہ پیپلز پارٹی یا چھ نکات کی مخالفت فوج کے ایما پر کی جا رہی ہے۔ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس موجودہ حکومت کے دور میں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ اور پیپلز پارٹی انہی رکاوٹوں کے باعث صرف ۸۳ نشستیں حاصل کر سکی۔ ان الزام لگانے والوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ چھ نکات کی مخالفت مغربی پاکستان کے عوام کر رہے ہیں یا مفاد پرست طبقے۔ یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ یہ مخالفت عوام کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ اسی لئے پیپلز پارٹی بھی ان کی مخالفت پر مجبور ہے۔ فوج کی اس سلسلے میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اور یہ عوام پر بہت بڑا الزام ہے۔ اگر چھ نکات عوام کے حق میں ہوتے تو مغربی پاکستان کے عوام ان کی مکمل حمایت کرتے خواہ فوج درمیان میں آتی یا کوئی اور طاقت۔

مغربی پاکستان کے عوام چھ نکات کے متعلق پوری طرح باخبر اور باشعور ہیں۔ اس لئے انہوں نے چھ نکات کی بنیاد پر کھڑے ہونے والوں کی ضمانتیں ضبط کروائیں۔ مشرقی پاکستان کے عوام کا چھ نکات کے بارے میں جو تاثر ہے اس کا تجزیہ ہم کر چکے ہیں۔ اس وقت وہی طاقتیں جو شیخ مجیب الرحمٰن کی شدید ترین مخالف ہیں اب ان کی ہم نوا بن چکی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آج تک برسر اقتدار طبقے کے خلاف نہیں ہوئے۔ اگر بھٹو کی پشت پر واقعۃً فوج ہوتی تو دائیں بازو کے رجعت پرست بھٹو کی قطعاً مخالفت نہ کرتے اس وقت پاکستان کی وحدت اور سالمیت کا سوال ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے ۲ر مارچ کو ہڑتال کی دھمکی دے دی ہے۔ بھاشانی، عطاء الرحمٰن، نورالامین اور مظفر بھی ان کے ساتھ ہیں۔ اگر ہڑتال کے ساتھ ساتھ کوئی تشدد بھی شروع ہوا اور پولیس اور فوج نے تشدد کے جواب میں تشدد اختیار کر لیا تو حالات اور خطرناک ہوں گے۔ نشانہ بہر حال عوام بنیں گے۔ شیخ مجیب الرحمٰن پہلے ہی خون کی ندیاں بہانے کا اعلان کر چکے ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کا خون کس کی گردن پر ہوگا۔ جو لوگ وحدت پاکستان کے علمبردار ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی رائے عامہ کو متاثر کریں اور انہیں "قربانی کا بکرا" نہ بننے دیں۔

صدر یحییٰ نے اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت تک ملتوی کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب مجیب، بھٹو، یحییٰ ملاقاتوں کا دور ہوگا۔ اب امکان یہی ہے تینوں شخصیتیں یہ ملاقاتیں اکٹھی کریں گی۔ اور ان کے لئے کراچی ڈھاکہ دونوں شہر منتخب کئے جائیں گے۔ یہ ملاقاتیں اگر زیادہ دیر تک جاری رہیں تو حالات اور مایوس کن ہوں گے۔ موجودہ اقتصادی بحران نے عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے سرمایہ دار اور صنعت کاروں نے ایک سازش کے ذریعے تمام اشیائے ضروریہ کی قیمتیں بڑھا دی ہیں عوام اس وقت مسائل میں بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ آئین سازی اور انتقال اقتدار میں تاخیر سے ۲۲

باقی صفحہ ۴۲ پر

سرورق کی تصویر

ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کی زیر تعمیر عمارت کی اس تصویر میں مزدور اور اُس کی چھتری عمارت سے بلند تر ہو گئی ہے۔ یہ ایک زاویۂ نگاہ ہے۔ یہ مزدور۔ ملک کے محنت کشوں، کسانوں اور طالب علموں کی علامت ہے۔ اور چھتری۔ ان عوامی طبقوں کے حقوق کی ضمانت کا نشان" اسمبلی کی پارلیمانی سیاست کی علامت ہے۔ عوامی طبقوں کے حقوق کی ضمانت پارلیمانی سیاست کی کارروائیوں سے بہر حال بلند تر اور عظیم تر ہے۔ اسمبلیاں منعقد ہوتی ہیں، عمارتیں بنتی ہیں۔ اسمبلیاں اور اُن کی عمارتیں مزدوروں کے خون پسینے پر کھڑی کی جاتی ہیں۔ لیکن جب اُن کے حقوق کی ضمانت نہیں دی جاتی تو نیچے آ گرتی ہیں۔ اس وقت ملک کو جو آئینی بحران درپیش ہے اس میں عوامی طبقوں کے حقوق کی علمبرداری تو کی جا رہی ہے لیکن کون جانے کہ یہ علمبرداری کس کے پیش نظر ہے اور کس کے نہیں۔ یہ چھتری ہمیشہ یوں ہی بلند رہے گی۔ تنی رہے گی۔ اور جب تک اس کا سایہ قائم ہے۔ پاکستان قائم ہے۔ اسمبلیاں آتی رہیں گی جاتی رہیں گی۔

نکسن کے پیٹ میں ایشیا کی سلامتی اور برِ صغیر کے امن کا درد پھر اُٹھا ہے

امریکہ چین سے پاکستان کی دوستی کا انتقام لے رہا ہے

افضل صدّیقی

امریکہ کے صدر نکسن کے پیٹ میں جنوب مشرقی ایشیا کی سلامتی کا درد پھر اُٹھا ہے۔ پاکستان میں ۳ مارچ سے قومی اسمبلی کا اجلاس ہونے والا ہے اور اسی تاریخ سے بھارت میں عام انتخابات ہو رہے ہیں۔ ایسے نازک موقعے پہ ایشیا کی سلامتی اور برصغیر پاک و ہند میں امن برقرار رکھنے کی فکر سب سے زیادہ امریکہ کو ستاتی ہے اور امریکی صدر کو چین اور روس کے مفادات ان علاقوں میں ناجائز اور اپنے مفادات جائز نظر آنے لگے ہیں۔ جن کی نگرانی کے لئے انھوں نے ایشیا اور افریقہ میں جابجا اپنے جوزف فاربلینڈ بکھیر رکھے ہیں جن کا کام وہاں کے لوگوں کو یہ باور کرانا بھی ہے کہ ہر جگہ کے امن کی سول ایجنسی امریکہ کے پاس ہے اور روس بھی جب سے پر امن بقائے باہمی کا قائل ہُوا ہے امریکہ کے شانہ بشانہ ان علاقوں کی شانتی رکھشا کی ٹھیکیداری میں شامل ہوگیا ہے اس لئے ان دونوں غیر ملکی طاقتوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ دونوں بہت بے ضرر اور چھوٹی طاقتیں ہیں۔ لیکن جب مل کر اپنے مشترکہ مفادات کی نگرانی کرتی ہیں تو بہت بڑی قوت بن جاتی ہیں لہٰذا دوست، ہمارے قریب آؤ اور ہمیں اپنے قریب آنے دو۔ تم ہمارے ہو، ہم تمہارے ہیں۔ ایشیائی افریقی اور لاطینی امریکی ممالک کے لئے اسی پر فریب پالیسی کی وضاحت امریکہ کو سال میں کئی بار کرنی پڑتی ہے۔ نکسن صاحب بہادر کو بھی پاکستان کے یومِ شوکتِ اسلام کی طرح یومِ سرمایہ داری منانا پڑتا ہے۔ اس دن وہ اپنے حواریوں کی کانگریس کے نام پیغام بدانجام دیتے ہیں۔ اپنے تازہ پیغام میں انھوں نے پنٹاگان کی پالیسی کا مقصد واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جنوبی ایشیا میں ہماری پالیسی یہ ہے کہ اقتصادی اور سیاسی چیلنج کا مقابلہ کیا جائے اور پاکستان اور بھارت کے تعلقات کو مزاحمت کے بجائے تعاون میں تبدیل کیا جائے۔ ان کی مراد یہ ہے کہ پہلے جنوبی ایشیا میں اقتصادی اور سیاسی چیلنج پیدا کیا جائے۔ پھر اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے دوسروں کے اندرونی قومی معاملوں میں اپنی ٹانگ اڑائی جائے۔ اور اس طرح دُنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی جائے کہ جائز مفادات تو ہمارے ہیں اور ہمیں

امریکہ کو

ہند چینی

میں اپنی ناک

اونچی رکھنے کی

فکر پریشان

کر رہی ہے

جنوبی ایشیا کی سلامتی کی اس قدر فکر ہے کہ ہم ان "جائز" مفادات کو بھی قربان کرنے کو تیار ہیں۔ ویتنام، کمبوڈیا، لاؤس کو نکسن صاحب اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں امریکی نوآبادی تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ جب چاہتے ہیں وہاں اپنے جائز فوجی، اقتصادی اور سیاسی مفادات کا اکھاڑہ جما دیتے ہیں اور کہتے یہی ہیں کہ امریکہ تو وہاں اقتصادی اور سیاسی چیلنج کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اس قسم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے بہانے پنٹاگان نے اپنے ملک کو دیوالیہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ لاکھوں امریکی افلاس اور بے روزگاری سے تنگ آکر بغاوت کر بیٹھے ہیں۔ اس نام نہاد غیر جانبداری کی پالیسی کے خلاف امریکی ریاستوں میں خونریز احتجاجی مظاہرے روز کا معمول بن گئے ہیں۔ کسانوں، مزدوروں اور طلبا میں بے چینی اور اپنی حکومت کے خلاف نفرت انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ مگر نکسن انتظامیہ کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ قومی سلامتی کی بھی اُسے فکر نہیں ہے اسے دلچسپی صرف اس بات سے ہے کہ ہند چینی میں اپنی ناک کس طرح اونچی رکھی جائے۔ اربوں ڈالر اسی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے جھونکے جا رہے ہیں اور اپنے نوجوانوں کو قومی ترقی و خوشحالی کے احساس اور انسانی بہبود، رواداری، مروّت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کے شعور اور پاسداری سے یکسر محروم کر کے انھیں چھوٹے اور مظلوم ملکوں میں جنگ کے لئے توپوں کا نوالہ بنایا جا رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اب امریکی طلبا، مزدوروں اور کسانوں میں تیزی سے یہ احساسِ محرومی جڑ پکڑ رہا ہے اور وہ بھوک اور افلاس سے مرنے کے بجائے کھل کر اپنی حکومت کے خلاف بغاوت پر اُتر آتے ہیں لیکن نکسن انتظامیہ کو ایشیائی اور افریقی ممالک میں دخل اندازی سے اتنی فرصت نہیں ملتی کہ اپنے اندرونی مسائل کو سلجھانے کی طرف بھی توجہ دے سکے۔

نکسن صاحب کو زیادہ پریشانی برصغیر کے مسائل سے ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ان مسائل سے ان کے سوا کوئی اور غیر ملکی طاقت دلچسپی لے۔ گویا چھوٹے ملکوں کو اپنا دستِ نگر بنانے کی اجارہ داری بھی مسٹر نکسن اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک

پاکستان کو دست نگر بنانے کی کوششیں جاری ہیں

طرف تو وہ یہ کہتے ہیں کہ امریکہ برصغیر میں چین اور روس کے جائز مفادات کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ کوئی غیر ملکی طاقت اس علاقے میں زیادہ اثر نہیں رکھتی۔ ہم تو اس سے دلچسپی رکھتے ہیں کہ برصغیر بڑی طاقتوں کی آماجگاہ نہ بنے۔ نکسن صاحب کو اپنی پرفریب غیر جانبداری کا ڈھول پیٹتے ہوئے یہ خیال بھی نہیں رہا کہ جن بڑی طاقتوں کا وہ ذکر کر رہے ہیں ان میں وہ خود بھی شامل ہیں۔ اب اگر امریکہ ہی ان چھوٹے ملکوں کو اپنی آماجگاہ اور حاشیہ بردار نہ بنائے گا تو اور کونسی طاقت یہ جرأت کر سکتی ہے، اور پھر امریکہ کے ہوتے ہوئے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ کیوں یہ کہتے کہ پاکستان امریکہ سے گہرے تعاون کی پوزیشن سے ہٹ کر تین طاقتوں سے تعاون کی راہ پر چلا گیا ہے اور بھارت ابھی تک غیر جانبداری کی پالیسی پر قائم ہے۔ ہائے بچارے نکسن صاحب کو کتنا دکھ ہے اس بات کا کہ پاکستان صرف اُن سے تعاون کرنے کے بجائے تین طاقتوں سے تعاون طلب کر رہا ہے۔ پاکستان صرف امریکہ سے بھیک مانگتا رہے تو غیر جانبدار ہے۔ کسی اور ملک سے دوستی اور تعاون بڑھائے تو قطعی جانبدار ہو گیا۔ نکسن صاحب بھارت سے بڑے خوش ہیں جو ان کے بقول ان کا کاسہ لیس ہونے کے باوجود امریکی چھاپ غیر جانبداری پر قائم ہے۔ غیر جانبداری کی امریکہ جو تعریف بیان کرتا ہے اس کی قلعی اب کھل چکی ہے۔ چین کو وہ اقوامِ متحدہ کا رکن بنتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس کے نزدیک ۸۰ کروڑ کی آبادی والا ملک اقوامِ عالم کی برادری میں شامل ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ اور مٹھی بھر انسانوں کے غیر قانونی دیس فارموسا کو یہ اعزاز اس لئے سونپا گیا ہے کہ وہ صرف امریکہ کو دنیا کی واحد قوت سمجھتا ہے اور امریکی مفادات کی نگرانی کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیتا ہے۔

۱۹۶۵ء میں بھارت کو کس نے پاکستان پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا تھا اور — کیوں ؟

بات گھوم پھر کر وہیں آجاتی ہے کہ امریکہ پاکستان کو بھارت کی طرح اپنا ہی جانبدار رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہیں کہ چین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں سے پاکستان اقتصادی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات استوار کرے۔ امریکہ کو سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ پاکستان نے آزاد خارجہ پالیسی کیوں اختیار کر رکھی ہے اور وہ امریکی حلقۂ اثر سے کیوں نکلتا جا رہا ہے؟ امریکی امداد پر اس کا انحصار پہلے جیسا کیوں نہیں رہا۔ چین سے پاکستان کی رغبت کیوں بڑھ رہی ہے۔ چین بغیر سود اور بلا کسی شرط کے پاکستان کو ہر طرح کی امداد دینے کے لئے کیوں آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان نے ایک چین ہی کی امداد قبول نہیں کی تھی بلکہ ہر ملک کے لئے اس نے تعاون اور دوستی کے دروازے کھول دیئے تھے۔ بس اسی قصور کی سزا دینے کے لئے پاکستان پر بھارت سے حملہ کرایا گیا۔ کشمیر کے معاملے میں پاکستان کو نظر انداز کر کے کھل کر بھارت کی حمایت کی گئی۔ مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ امریکہ ہی اب تک بنا رہا۔ دوسری طرف اپنے غیر جانبدار دوست بھارت کی پیٹھ تھپکتا رہا۔

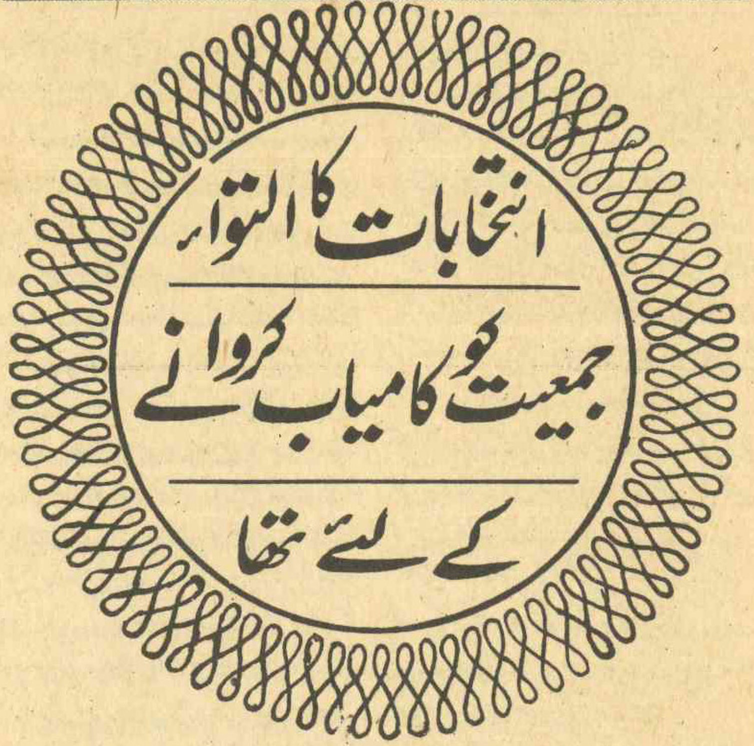
برصغیر میں دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت امریکہ کے مفادات کھل کر سامنے آچکے ہیں۔ کشمیر میں امریکہ کا اپنا مفاد یہی ہے کہ چین کے گرد اپنے حصار کو مضبوط کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد پاکستان سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُس نے پوری وادیٔ کشمیر کو بھارت کے تسلط میں دے دیا ہے۔ بھارت اپنی آزادی کی حفاظت امریکہ ہی کے ذریعے سے کر سکتا ہے۔ اسی لئے بھارتی عوام کو ۱۹۶۲ء میں چین سے بدظن کر دیا گیا۔ چین سے بھارت کا سرحدی جھگڑا چھیڑ کر جنگ کی گئی۔ اور جب بُری طرح پٹائی ہوئی تو بھوکے بھارتیوں کو یہی باور کرایا گیا کہ تمہارا اصل دشمن چین ہے اور امریکہ سے بڑا کوئی دوست نہیں۔ پاکستان اور چین کے خلاف معاندانہ مہم کو جاری رکھنے کے لئے امریکہ کو وہی پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں جو ہند چینی میں آزادی کے متوالوں کو کچلنے کے لئے بیلنے پڑ رہے ہیں۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ تبت اور سنکیانگ کے درمیان اقصائے چین کی سطح مرتفع پر جو شاہراہ بنی ہے وہ کشمیر میں مشرقی لداخ کے بالائی حصے سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے۔ یہ چین کی شہ رگ ہے اور اس کو کاٹنے کے لئے امریکہ اپنی تمام سازشیں صرف کر رہا ہے۔ اس کو اب تک یہ اندیشہ ہے کہ کشمیر پر اگر پاکستان کا غلبہ ہو گیا تو پھر اُس کی یہ سازش کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اسی لئے امریکی جنگ بازوں نے یہ طے کیا کہ کشمیر میں پاکستان کے اثر کو زائل کیا جائے اور آزاد خارجہ پالیسی اختیار کرنے کی پاکستان کو سزا دی جائے۔ چنانچہ ۱۹۶۵ء میں پاکستان پر بھارت سے حملہ کروا کر پاکستان کی معیشت اور ترقی کے منصوبوں کو پارہ پارہ کرنے کی ٹھانی گئی۔ پاکستان کو سزا دینے اور اس سے انتقام لینے کا یہ سلسلہ بدستور جاری ہے۔ مشرقی پاکستان میں امریکہ اپنے فوجی اڈے قائم کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ پاکستان کے مختلف صوبوں پر اپنی مرضی چلانے کے لئے چھ نکاتی سازش میں اس کا ہاتھ ہے۔ ہر پاکستانی کو یہ بات معلوم ہے کہ ہمیں جو غیر ملکی قرضے اور امداد ملتی ہے اس میں ستر فیصد حصہ امریکہ کا ہوتا ہے۔ چھ نکات کی بنیاد پر آئین بنا تو ظاہر ہے کہ صوبے کے اختیارات غیر ملکی امداد اور قرضوں کے معاملے میں اُن کے اپنے ہوں گے اور ہر صوبہ حالات سے مجبور ہو کر امریکی امداد کی شرائط اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرے گا

امریکہ مرکزی مقننہ کے ۵۱ فیصد ووٹوں کا واحد

باقی صفحہ ۴۲ پر

امریکہ کی غیر جانبداری کا ڈھول پھٹ چکا ہے





اشرف شاد

جامعہ پنجاب میں جہانگیر بدر کے بعد جامعہ کراچی کے انتخابات میں ترقی پسندوں کی ناکامی نے مودودی جماعت کے سوکھے دھانوں میں نئے سرے سے پانی دیا ہے۔ جامعہ پنجاب تو ہم سے خاصی دور ہے اس لئے اس وقت اس بات کا تفصیلی جائزہ ممکن نہیں کہ این ایس ایف کے نامزد امیدوار راشد بٹ تو اکثریت سے جامعہ پنجاب کے نائب صدر منتخب ہو جاتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ جاتی انتخابات میں اور پنجاب یونیورسٹی لاء کالج میں بھی این ایس ایف کے تمام امیدوار زبردست کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ لیکن صدر کے عہدے پر ترقی پسند جماعتوں کا وہ امیدوار ہار جاتا ہے۔ جو گذشتہ سال بھر طلبہ کیلئے جدوجہد کرتے ہوئے زنداں کی سلاخوں کے پیچھے رہا ہے۔ تاہم اس ضمن میں این ایس ایف لاہور کے صدر رضا حمید کی یہ بات خاصی بھاری بھرکم محسوس ہوتی ہے کہ پیٹی بورژوا کلاس کی رومانیت اپنی تسکین کے لئے جدوجہد کے خارزار پا بھرے ہوئے نقوش کے علاوہ کچھ اور لوازمات کا تقاضا بھی کرتی ہے اور اسی بنیاد پر ہم پھر یہ بھی سوچتے ہیں کہ جامعہ کراچی میں ترقی پسندوں کے امیدوار اشفاق اور انجم کیوں ہارے جبکہ وہ تو یہ لوازمات بھی پورے کرتے تھے۔

اشفاق اور انجم کے ہارنے کی بنیادی وجوہات تو وائس چانسلر، ان کے حواریوں اور انتظامیہ کے دوسرے ارکان کی جانبداری اور دھاندلیاں ہیں اور یہ تمام صورت حال اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک کہ موجودہ وی سی کو ان کی تمام تر بدعنوانیوں سمیت جامعہ سے نکال کر نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ کانٹے ہمارے اپنے دامن میں بھی اٹکے ہوتے ہیں۔ اور ان سب کا تجزیہ اس لئے ضروری ہے کہ جامعہ کے انتخابات میں شکست یا فتح صرف جامعہ کے طلبہ کا داخلی مسئلہ نہیں۔ بلکہ اس کے نتائج کسی قدر ملک کی سیاست پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ گزشتہ سال اپریل میں پی آئی اے کے ریفرنڈم کی اہمیت بھی اسی لئے تھی۔ اس لئے کہ ٹریڈ یونین تحریک میں اکثر و بیشتر مالکوں کے ایجنٹ سازشوں کے ذریعے قیادت پر قبضہ کر لیا کرتے ہیں۔ اور ان کے خلاف جدوجہد بھی جاری رہتی ہے۔ لیکن پی آئی اے میں یہ ایجنٹ ایک پوری سیاسی سوچ کا لبادہ اوڑھ کر آئے تھے۔ اور اس وقت جبکہ ملک کی سیاست ایک واضح شکل اختیار کرنے جا رہی تھی مزدور تحریک پر ان کے پہلے چھاپے کی کامیابی یا ناکامی پورے ملک کی سیاست کو متاثر کرنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ اس کے فوری بعد پھر جامعہ کراچی کے انتخابات میں اعجاز شفیع کی کامیابی۔ یہی وہ چیزیں تھیں جنہوں نے جماعت مودودی کی اخلاقی جرأت و ہمت اتنی بڑھا دی کہ ۳۱ مئی کے شوکت اسلام میں وہ خود کو اسلام پسندوں کا سرغنہ سمجھ کر سب سے اپنے رشتے توڑ بیٹھی۔

جامعہ کراچی میں انتخابات کا مرحلہ اس وقت آیا جبکہ ملک کے پہلے انتخابات ختم ہو چکے تھے۔ ترقی پسند قوتیں کامیاب ہو چکی تھیں۔ سیاسی مطلع بڑی حد تک صاف ہو چکا تھا۔ اور اس سے پہلے اسی ابر آلود فضا میں کائیں کائیں کرنے والے سارے کوے اپنی اپنی پناہ گاہوں میں دبک بیٹھے تھے۔ ترقی پسند قوتوں کا مورال بلند تھا۔ طلبہ میں بے پناہ جوش و خروش تھا۔ اور اس بات کے واضح امکانات تھے کہ اس مرتبہ وائس چانسلر میجر آفتاب اور انتظامیہ کی پوری فوج اپنی تمام تر دھاندلیوں اور بدعنوانیوں کے باوجود اپنے من پسند نتائج حاصل نہ کر سکے گی۔ طلبہ نے اپنے اس جوش و خروش کا بے مثال مظاہرہ بارہا کیا۔ این ایس ایف نے اپنے جتنے بھی انتخابی جلوس نکالے وہ ہر امیدوار اور جماعت کے جلوس سے زیادہ اچھے۔ بڑے اور پرجوش تھے۔ انتخابات سے ایک روز قبل تینوں امیدواروں نے اپنی اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے جو جلوس نکالے انہوں نے انتخابات کا فیصلہ این ایس ایف کے حق میں دے دیا تھا۔ جامعہ کے طلبہ، اساتذہ اور شاید خود وی سی بھی اس کے گواہ ہوں گے! لیکن اس کے باوجود

کچھ کانٹے اپنے دامن میں بھی اٹکے ہوئے ہیں

نتیجہ اس کے برعکس رہا۔ جمعیت طلبہ کا پورا پینل (ایک جوائنٹ سیکرٹری کو چھوڑ کر) کامیاب ہوا۔

انتخابات کے یہ غیر متوقع نتائج، ان لوگوں کے لئے اتنے غیر متوقع نہیں تھے جو شروع سے جامعہ کی پوری صورت حال کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ یونیورسٹی کی صدارت کا انتخاب لڑانے کے لئے پورے ایک سال تک اپنے امیدوار کا "امیج" بناتی ہے۔ جامعہ کی مختلف تقریبات کے ذریعے مختلف سوسائیٹیز کے ذریعے جماعتی اساتذہ کے ذریعے مقبوضہ اخبارات کے ذریعے، اس طرح جب انتخابات کے وقت امیدوار کی حیثیت سے اسے متعارف کرایا جاتا ہے تو وہ جامعہ کے لڑکوں کے لئے نیا نہیں ہوتا۔

اس سال دوست محمد فیضی کو زاہد حسین بخاری کے بجائے انتخاب لڑنا تھا۔ گذشتہ تمام سال فیضی کو یونیورسٹی میں ایک مقام دلانے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ لیکن صدارت ان کا مقدر نہ تھی۔ اور وہ ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ جس کی وجہ سے امیدواری کا تمغہ بھی نہ سج سکا۔ لیکن ان پر سال بھر تک اتنی محنت ہوئی تھی کہ ان کا خصوصی طور پر دوبارہ امتحان لینے کا پروگرام بنایا گیا۔ وی سی صاحب کے لئے یہ بے قاعدگی نئی نہیں تھی، لیکن اس وقت ان کے خلاف رائے عامہ اتنی شدت سے بیدار تھی کہ وہ ایسا کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ جمعیت طلبہ کے پاس اس وقت اور کوئی ایسا "پکا" لڑکا نہ تھا جو ان کی جگہ لے سکے۔ لہذا مجبوراً قرعہ فال زاہد حسین بخاری کے نام نکلا جو ایک سال قبل ہی لاہور سے بی اے کر کے آئے تھے۔ اور وہاں جماعت کے غنڈے حافظ ادریس کے قریبی ساتھی کی حیثیت سے مار دھاڑ سے بھرپور بہت سی سرگرمیاں انجام دے چکے تھے۔

زاہد حسین بخاری کراچی کے لئے نئے امیدوار تھے۔ لیکن لاہور والے انہیں نہیں بھولے اور وہ آج بھی ان میں سے بہت سے دلوں کی دھڑکن بن کر دھڑکتے ہیں۔ جامعہ پنجاب کے وائس چانسلر علامہ علاؤالدین صدیقی پر حملہ کرنے اور اس غنڈہ گردی میں پوری طرح ملوث ہو کر گرفتار ہونے کا قصہ تو ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ لیکن گورنمنٹ کالج میں ان کے ساتھ پڑھنے والے ان کے ایک پرانے دوست نے ان کے بارے میں ہمیں بہت سی کہانیاں سنائیں۔ جن میں سے ایک کہانی کا تعلق ان کے کالج سے نکالے جانے والے واقعہ سے ہے۔ ہم اس گندگی کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھتے کہ یہ معیار صحافت شورش کاشمیری یا قریشی بھائیوں کی ہٹی کے صحافیوں کا ہے۔ بہرطور زاہد حسین بخاری جمعیت کی حکمت عملی کی تبدیلی کے ساتھ ہی امیدوار بن گئے اس زمانے میں جامعہ کے میگزین (جسے جامعہ کے طلبہ نے مودودی نمبر کا نام دیا ہے) کی تدوین کا کام بھی جاری تھا۔ اس میں بخاری صاحب کو بھی کسی حیثیت پر براجمان کیا گیا۔ میگزین میں موصوف کی پورے صفحے کی خوبصورت سی تصویر شائع ہوئی اور عین انتخابات سے ایک دو ہفتے قبل یہ رسالہ کالج کے طلبہ میں تقسیم کر دیا گیا ــــ اس کے ساتھ ہی مقبوضہ اخبارات میں ان کی تصویروں کے مختلف پوزوں کی اشاعت کا اہتمام ہوا۔ اس طرح راتوں رات ان کی لیڈری پروجیکٹ ہو گئی۔

شعبۂ تادیب
کے سربراہ میجر
آفتاب نے جعلی
ووٹ کو پچھلی سمت
سے بس میں
بٹھا کر بھگا دیا

ادھر یہ سارا کام جاری تھا دوسری طرف این ایس ایف کے دونوں گروپ ابھی تک اس فیصلے پر بھی نہیں پہنچے تھے کہ انتخابات میں کسے امیدوار بنائیں، کس کی حمایت کریں۔ مل کر لڑیں یا علیحدہ علیحدہ، صدر کس کا ہو اور جنرل سیکرٹری کس کا۔ اور پھر یہ انتخاب لڑیں بھی یا نہیں ــــ بورژوا سیاست کے اس گورکھ دھندے میں اپنی ٹانگ پھنسائیں یا نہیں؟ اور اس دوران میں جامعہ کے وہ طلبہ کہ ترقی پسند نظریات سے جنہیں بڑی انسیت ہے۔ لیکن جن کی اکثریت صرف این ایس ایف تو جانتی ہے۔ لیکن کاظمی اور رشید گروپ میں کیا فرق ہے' یہ انہیں معلوم۔ یہ لوگ جو کہ اکثریت میں تھے عرصے تک ایک مخمصے کا شکار رہے اور پھر ان میں سے بہت سے یا تو کلاسوں میں واپس گئے اور کچھ آزاد امیدوار کے دامن پکڑ کر لٹک گئے۔

این ایس ایف کے تضادات اسی طرح چلتے اور بڑھتے رہے۔ اور اس دوران میں جمعیت کے امیدوار اپنے امیدوار کو اٹھائے جامعہ کی ہر دہلیز پر جاتے اور ووٹوں کے لئے گڑگڑاتے رہے۔ جب دونوں گروپ مل کر ایک فیصلے پر متفق ہوتے تو بہت سا وقت نکل چکا تھا فیصلے پر متفق ہونے کے بعد بھی دونوں گروپوں کے کارکنوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں تھی۔ کوئی یکسانیت نہیں تھی۔ خصوصاً کاظمی گروپ تو کہ اپنے اندرونی تضادات کے ہاتھوں پہلے ہی بادی، انیس باقر، اور طارق فتح کی مثلث میں بٹا ہوا ہے۔ اس موقع کو سیاسی حیات تو حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا چاہتا تھا۔

اس کے باوجود عام طلبہ میں اتنا جوش و خروش تھا کہ وہ این ایس ایف کے ان تمام تضادات اور موثر قیادت کی عدم موجودگی کے باوجود ڈاؤن ڈاؤن وی سی کے نعروں سے در و بام ہلائے ہوئے تھے۔ وی سی اور ان کے

زاہد حسین بخاری لاہور میں مار دھاڑ کا بھرپور شاہکار تھے

سارے حواری اس صورت حال سے سخت متذبذب اور پریشان تھے۔ ساتھ ہی انہیں اپنی دھاندلیوں کے غیر موثر ہونے کا خطرہ بھی کھائے جا رہا تھا۔ اس لئے فضا جمعیت طلبہ کے حق میں پوری طرح مستحکم کرنے کے لئے انہوں نے ۲۸ر جنوری کو دو روز کے لئے یونیورسٹی بند کرنے کا اعلان کر دیا۔ جبکہ ۲ر فروری انتخابات کے لئے طے کی جا چکی تھی۔ اور یہ دو روز گزرنے سے قبل ہی مزید دس روز بند کرنے کا حکم نامہ بھی جاری کیا گیا۔ بہانہ لسانی بنیادوں پر ہونے والے فسادات کو بنایا گیا تھا۔ حالانکہ یونیورسٹی سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی یونیورسٹی اس سے متاثر ہوئی۔ ان بارہ روز کے اندر اندر ایک اطلاع کے مطابق تقریباً ڈھائی سو داخلے کرائے گئے۔ یہ سارے داخلے جماعت مودودی کے حامی مختلف شعبہ جات کے صدور کی خصوصی اجازت سے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کے دفتر سے طلبہ کے گھروں کے پتے نکال کر جمعیت طلبہ کے حوالے کئے گئے اور ان کے ورکر ڈاکیوں کی طرح ان پتوں پر طلبہ سے گھروں میں جا کر ملتے رہے۔

انتخابات کی نئی تاریخ کا اعلان ہوا، یونیورسٹی کھلی تو جمعیت طلبہ کو ان کے سرپرستوں نے یقین دہانی کرا دی تھی۔ یہ یقین دہانی ان کے چہروں سے چھلکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ انتخابات کا دن آیا تو اس روز جمعیت طلبہ کے سارے ورکر شعبہ تادیب کا بیج لگا کر من مانی کاروائیاں کرنے کے لئے آزاد تھے۔ این ایس ایف کے لڑکوں پر داخل ہونے کی پابندی تھی۔ حسنین بخاری کو ڈاکٹر بقائی نے تین مرتبہ اندر آنے سے روکا۔ جامعہ کی حدود میں صبح جمعیت طلبہ کے امیدواروں کا انتخابی جلوس نکلا۔ ان کی قیادت اعجاز شفیع گیلانی اور سلیم جہانگیر کر رہے تھے جو کہ اب جامعہ کے طالب علم نہیں ہیں طلبہ نے اس پر احتجاج کیا تو کوئی سنوائی نہ ہوئی۔ این ایس ایف کے جنرل سیکرٹری کے امیدوار نجم الہدیٰ نے اعجاز شفیع اور سلیم جہانگیر کو روکا۔ یہ بالکل غنڈوں کے سے انداز میں انہیں مارنے کے لئے جھپٹے۔ طلبہ اس پر بری طرح مشتعل ہوئے اور انھوں نے اس غنڈہ گردی کا موثر طریقے سے جواب دیا۔

ہسٹری ڈیپارٹمنٹ کے پولنگ بوتھ پر این ای ڈی کالج کا ایک لڑکا جس کا نام اغلباً فرید تھا جعلی ووٹ ڈالتے ہوئے پکڑا گیا۔ اس کے پکڑنے کا سہرا بھی طلبہ کے سر تھا۔ تحقیقات پر معلوم ہوا کہ وہ این ای ڈی میں تھرڈ ائیر مکینیکل کا طالب علم ہے اسے پکڑ کر انتظامیہ کے حوالے کیا گیا۔ لیکن اس کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی نہیں ہوئی بلکہ اسے پچھلی سمت سے بس میں بٹھا کر بھگا دیا گیا۔ اور شعبہ تادیب جس کے سربراہ میجر آفتاب ہیں۔ اس فرار کو کامیاب بنانے میں پوری طرح ملوث تھے۔

جس وقت ووٹوں کی گنتی ہو رہی تھی کسی کو اس جگہ جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ماسوائے جمعیت کے کارکنوں اور ان رہنماؤں کے جو جامعہ کے طالب علم تک نہیں تھے۔ گنتی کے وقت اندر اعجاز شفیع گیلانی سلمان جاوید اور الیاس فاروقی موجود تھے۔ جب کہ وہ نہ تو جامعہ کے طالب علم ہیں اور نہ کسی امیدوار کے پولنگ ایجنٹ تھے۔ بار بار احتجاج کے باوجود انہیں باہر نہیں نکالا گیا۔ پولنگ آفیسر ڈاکٹر عزیز نے جمعیت کے جنرل سیکرٹری فرخ کے پولنگ ایجنٹ کو اپنے برابر میں بٹھایا تھا جب کہ دوسرے پولنگ ایجنٹوں کو دور بٹھایا گیا تھا اور انہیں بیلٹ پیپر دکھائے تک نہیں گئے گنتی جاری تھی۔ رات بیت چلی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ میں بھی اس کارزار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہر آدھے گھنٹے بعد اوپر گیلری سے کاغذ کی ایک گولی کسی جمعیت کے ورکر کے پاس ٹپکتی اور پھر کسی گوشے میں وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پڑھتا اس طرح ہر لمحہ وہ تازہ ترین انتخابی نتائج سے خبردار کئے جاتے رہے۔ اس دوران میں اطلاع ملی کہ نجم تین ووٹوں سے جیت رہا ہے۔ اور اسی وقت میں نے دیکھا کہ اوپر سے سبز گاؤن پہنے ہوئے ایک صاحب جو گنتی میں موجود تھے۔ سیڑھیاں اترتے نیچے آئے۔ اور ایک طرف بڑھ گئے۔ ان کے ساتھ جمعیت سے سرگرم کارکنان بھی تھے۔ بہت دیر تک سرگوشیاں جاری رہیں۔ اور اس کے بعد وہ پھر اپنی متعین جگہ پر چلے گئے۔ اس کے بعد جب ہم نے فیصلہ سنا تو معلوم ہوا کہ نجم ۱۷ ووٹ سے ہار گئے ہیں جبکہ ان کے اسّی ووٹ مسترد کئے گئے۔ اسی طرح اشفاق توفیق دو سو کچھ ووٹ سے ہار گئے جب کہ ان کے ۲۸۵ ووٹ مسترد کر دیئے گئے تھے۔

نتائج کے اعلان کے ساتھ ہی این ایس ایف کے رہنما حسنین بخاری کو اوپر جمعیت کے لڑکوں نے گھیر لیا اور دھاندلیوں کے خلاف احتجاج کرنے پر بری طرح مارا پیٹا۔ ان کے منہ سے خون کی ایک لکیر تھوڑی تک آئی ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود ان کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ افتخار چودھری اور مس نسرین تالپور جو پولنگ ایجنٹ تھے، باہر آئے تو نعروں کے اس احتجاج میں وہ بھی شریک ہو گئے۔ جمعیت نے اس موقع پر بے مثال غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔ اوپر گیلری سے لڑکوں پر لوہے کی کرسیاں پھینکیں۔ ان سے بھی دی سی کے خلاف نعروں کا طوفان نہ تھما تو دستی بموں سے دھماکے کئے۔

جوائنٹ سیکرٹری کے لئے آزاد امیدوار کنیز فاطمہ نے سب سے زیادہ ووٹ ۱۲۵۷ حاصل کئے تھے۔ ہوا کا رخ دیکھ کر جمعیت کے کارکنوں نے زاہد کنیز بھائی بھائی کے نعرے بلند کئے۔ اور کنیز فاطمہ (یاسمین حسن) دیر تک اور اس دن کے بعد بھی بار بار یہ تردید کرتی ہیں کہ ان کا جمعیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ کبھی تھا اور نہ ہو سکتا ہے۔

انتخابات سے دو ہفتے

قبل جامعہ کا میگزین

مودودی ممبر طلبہ

میں تقسیم کیا گیا

روزنامہ

الفتح

کراچی

کے سلسلے میں اہم

اعلان

قارئین کرام اور ہمارے اکثر احباب نے اصرار کیا ہے کہ

روزنامہ **الفتح** کراچی

کے کم سے کم شیئر کی قیمت دس۱۰ روپے مقرر کر دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس نیک مہم میں حصہ لے سکیں

اس سلسلے میں ضروری کاغذات تیار کیے جا چکے ہیں۔ جو احباب یہ حصص خریدنا چاہتے ہیں وہ اس پتے پر

منی آرڈر، چیک، ڈرافٹ بھیج کر شیئر خرید سکتے ہیں۔

تمام عوام دوست طاقتوں سے تعاون کی توقع ہے

پتہ یہ ہے

الفتح مطبوعات ۸۷-ڈی نرسری کمرشل ایریا۔ کراچی



نہتے اور غریب عوام ظلم و تشدد سے محفوظ نہیں رہ سکتے

پولیس کی لاٹھی عوام کی آواز کو کب تک دبائے گی؟

وقائع نویس

پولیس کی لاٹھیوں کے درمیان گھرے ہوئے اس شخص کو آپ سب پہچانتے ہیں۔

مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت سندھ اور پنجاب میں حکومتیں بنانے والی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کا رکن اور پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو کا نامزد جانشین ۔ اور اس کے ساتھ جہاں یہ سلوک ہو رہا ہے وہ کراچی ہے۔ جو سندھ کا دارالحکومت ہے ۔ اور جہاں اس پارٹی کی حکومت چند ہفتوں بعد بننے والی ہے ۔

ہمارے فوٹو گرافر نے یہ ایکشن تصویریں خصوصی طور پر بنائی ہیں ۔معراج محمد خاں کے لئے پولیس کی مار کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ ۱۹۵۸ء سے اس کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے ۔ لیکن ملک کے موجودہ حالات میں معراج محمد خان اور پیپلز پارٹی کے دوسرے رہنماؤں قومی اسمبلی کے ممبران کے ساتھ جو سلوک کیا گیا ۔اس کی عدالتی تحقیقات مکمل ہو چکی ہے ۔اس کی رپورٹ بھی پیش کی جا رہی ہے ہم اس واقعے کے مضمرات پر کچھ کہنا چاہتے ہیں ۔ ان کے ساتھ پولیس کا رویہ یونہی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ عوام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش ہے ۔ ملک میں پہلے عام انتخابات میں عوام نے جن نمائندوں کو منتخب کیا وہ اور عوام دونوں اس وقت سمجھ رہے تھے کہ عوام بہت بڑی طاقت ہیں ، اقتدار کا سرچشمہ ہیں یہ نمائندے بہت اہم شخصیت بن گئے ہیں ۔ اور پیپلز پارٹی بہت با اثر پارٹی بن گئی ہے ۔ عوام کا اعتماد بہت بڑی چیز ہے ۔ کراچی پولیس کے افسروں اور سپاہیوں نے دن دہاڑے ، سر بازار بغیر کسی اشتعال کے اس پارٹی کے بڑے رہنماؤں اور منتخب نمائندوں پر لاٹھیاں برسا کر عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے



پولیس کی مار پیٹ

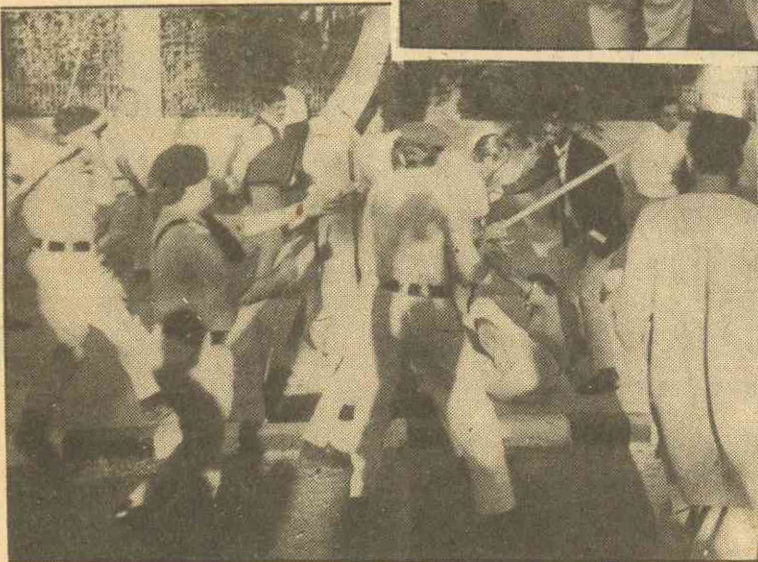
عوام کے خلاف زبردست سازش ہے

کہ ان نمائندوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔ پولیس پھر بھی بالاتر ہے ۔ پولیس کی لاٹھی عوام کی آواز کو اب بھی دبا سکتی ہے ۔

پیپلز پارٹی کے رہنما آئینی گتھیوں اور پارلیمانی کانفرنس کی تیاریوں میں الجھ گئے ۔ ورنہ یہ کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا ۔ جو پولیس عوام کے منتخب نمائندوں اور اکثریتی پارٹی کے معزز رہنماؤں پر



یہ ظلم و جبر کی منہ بولتی تصویریں ہیں



لاٹھی اٹھا سکتی ہے ۔ نہتے اور غریب عوام اس کے ظلم و تشدد سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں ۔ اس واقعہ پر پولیس کے خلاف زبردست احتجاج ہونا چاہیئے تھا ۔ یہ صرف کراچی پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی توہین نہیں تھی پوری قوم کی بے عزتی تھی ، پوری پیپلز پارٹی کی ہتک تھی ۔ پیپلز پارٹی کی تمام شاخوں اور تمام رہنماؤں کو اس پر احتجاج کرنا چاہیئے تھا ۔ اس سانحے کے ذمہ دار پولیس افسروں کو فوراً معطل کیا جانا چاہیئے تھا ۔ سب سے زیادہ افسوسناک پیپلز پارٹی کی عدم تنظیم ہے کہ اس کے وہ مشہور و معروف پیپلز گارڈ کہیں نظر نہ آئے جو پیپلز گارڈ اپنے رہنماؤں کی حفاظت نہیں کر سکتے وہ عوام کی حفاظت کیا کریں گے ؟



ابا سین

سیاسی مزاج اور جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے صوبہ سرحد تقریباً ۷ حصوں میں منقسم ہے۔ سوات۔ دیر۔ چترال۔ ہزارہ۔ ڈیرہ اسماعیل خاں، چارسدہ اور پشاور، دیر سوات اور چترال کے علاقے حال ہی میں نوابوں کے شکنجے سے آزاد ہوئے ہیں۔ ان علاقوں کے عوام ابھی تک سیاسی بلوغت کے اس مقام تک نہیں پہنچ سکے کہ جمہوری اور معاشی آزادی کے فلسفے کو یکجا طور پر سمجھ سکیں۔ ریاستی نظام سے گلو خلاصی چونکہ ان کی ذاتی اور طبقاتی جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہے اور چونکہ وہ جدوجہد کی قربانیوں کے حقیقی عمل سے نہیں گزرے ہیں اس لئے وہ ریاستی نظام کے خاتمے کے باوجود اپنے آپ کو ذہنی طور پر ابھی تک پرانے نظام سے علیحدہ نہیں سمجھ سکے۔ ضلع ہزارہ قدرتی جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے شمال مغربی سرحدی صوبے کے تمام اضلاع سے کٹا ہوا ہے۔ یہ ضلع باقی تمام اضلاع کے مجموعی مزاج سے الگ تھلگ اپنی ایک جداگانہ اور انفرادی حیثیت کا حامل ہے۔ بنیادی طور پر اس ضلع کا مزاج ۱۹۷۱ء میں بھی ۱۹۴۷ء ہی کے محور پر گھوم رہا ہے یہ ضلع صنعتی عہد کی تبدیلیوں سے نہ تو پوری طرح آگاہ ہے نہ ہی اس کی پرانی قیادت جدید سائنسی اور معاشی تقاضوں کی متحمل ہو سکی ہے۔ کوئی اور قیادت بھی نہیں ابھر سکی جو یہ فرض پورا کر سکتی اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ خان قیوم اس ایک ضلع سے دو مختلف تحصیلوں سے کامیاب ہوئے۔

ڈیرہ اسماعیل خاں دریائے سندھ کے پہلو میں واقع ہونے کے باوجود بیاباں ہے۔ یہ ضلع اپنے بنجر معاشی ذرائع کی وجہ سے مستقل نوعیت کی احساس کمتری میں مبتلا نظر آتا ہے۔ محدود پیداواری ذرائع اور دور افتادگی کی وجہ سے یہ ضلع تو کیا پورا ڈویژن قدامت پرستی کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے۔ ماضی میں اس ڈویژن کے ساتھ برتی گئی بے توجہی نے اس ڈویژن کے سیاسی مزاج کے تعین میں اہم کردار انجام دیا ہے۔

چارسدہ مردان، صوابی اور ان سے ملحقہ علاقے اپنی تمام تر زرخیزیوں کے باوجود خوانین کے تسلط اور ان کے پر فریب پختون نیشنلزم کے فلسفے کی گرد میں لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس علاقے کے عوام ڈیرہ اسماعیل خاں کے ملحقہ علاقوں کی طرح کٹر مذہبی تو نہیں ہیں۔ لیکن نیپ کے صوبائی اور لسانی نعروں کے سحر میں ضرور گرفتار رہیں۔

پشاور اور پشاور کے قرب وجوار کا زرعی اور نیم زرعی علاقہ مخلوط سیاسی جذبات اور مزاج کا حامل ہے۔ صنعتی عہد کی تبدیلیوں کے شعور کے فقدان کا مسئلہ یہاں بھی موجود ہے۔

سرحد کے مقامی تضادات کے ذیل میں یہاں پیپلز پارٹی کی مشکلات کی تین بڑی وجوہات ہیں (ا) اس صوبے کی شخصی نوعیت کی سیاست جس کا محور خان قیوم اور غفار خاں ہیں (ب) جاگیردارانہ اور مذہبی عناصر کا گٹھ جوڑ (ج) مقامی نوکر شاہی۔

(ا) یہ صوبہ سیاسی طور پر دو بڑے گروہوں میں منقسم ہے۔ ایک گروہ وہ جس کی قیادت شروع سے خان قیوم کر رہے ہیں۔ اور جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ پاکستان کے خالق ہیں۔ اور جو اس دعوے کی بنیاد پر پاکستان کے خاتمے تک قیادت اور سیادت کا حق طلب کرتے ہیں۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جس کی معنوی قیادت خان عبدالغفار خان کر رہے ہیں۔ جن کو پاکستان اور مسلم لیگ کے نظریات کی مخالفت اور بیخ کنی میں پیش پیش رہنے کے علاوہ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کروانے کا شرف بھی حاصل ہے۔ یہ جنگ جسے ۱۹۴۷ء میں اصولی طور پر ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ خان قیوم کی بدولت آج تک زندہ ہے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد جب خان قیوم کو اس صوبے کی سب سے بڑی کرسی ہاتھ لگی تھی ان دنوں اس صوبے میں ایسے لوگوں کی بہتات تھی جو پاکستان اور مسلم لیگ کیلئے اپنے خلوص، قربانیوں جدوجہد کے اعتبار سے خان قیوم سے زیادہ وزارت

قیوم لیگ اور ولی نیپ نے ایک دوسرے کے سہارے زندہ رہنے کی قسم کھا رکھی ہے

اعلیٰ کے مستحق تھے۔ خان قیوم کے لئے یہ امر ناقابل برداشت تھا۔ مسلم لیگ کے اندر کوئی ایسا گروپ خدمات کی بنیاد پر ان کے مفادات کے لئے خطرہ بن جاتے۔ چنانچہ انہوں نے تخت نشینی کے فوراً بعد مسلم لیگ اور پاکستان کے لئے ایک حقیقی خطرے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ جس کی بدولت وہ اپنے اقتدار کو مستحکم رکھ سکیں۔ اور مسلم لیگ کے اندر حق ناحق کی بات کرنے والوں پر کوئی قدغن لگا سکیں۔ چنانچہ انہوں نے سرخپوشوں اور خدائی خدمتگاروں کے نام پر ایک ایسا خطرہ پیدا کر لیا جس کا در اصل کوئی وجود نہ تھا۔ کانگریسی اور سرخپوش تحریک قیام پاکستان کے بعد معنوی طور پر ختم ہو گئی تھی۔ جسے خان قیوم کی جابرانہ حکمت عملیوں کے رد عمل نے حیات نو بخشی اس مقصد کے لئے انہوں نے سرخ پوشوں اور خدائی خدمت گاروں کے رہنماؤں کو جیلوں میں ٹھونسا۔ ان پر تشدد کیا اور بار بار تشدد کے بہانے ڈھونڈ نے مرکز کے ساتھ ملی بھگت کر کے ایسے حالات پیدا کئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اس گروپ کو دشمن اور خطرناک بنا کر پیش کریں۔ اور اپنی آہنی قیادت کا لوہا منوائیں۔ صوبہ سرحد کی یہ دو گروہی سیاست جو خان قیوم کی اپنی پیدا کردہ تھی، ۱۹۴۷ء سے اس صوبے کے طبقاتی شعور کے استحصال میں مصروف تھی۔ خان قیوم کے مفروضہ خطرات اور تشدد کے رد عمل کے طور پر یہ بات کوئی عجیب نہیں کہ وہ جہد البقا کے اصولوں پر ابھی تک اسی حیثیت سے موجود ہیں فرق صرف اتنا ہی ہوا ہے کہ پہلے وہ سرخپوش تحریک، خدائی خدمت گار وغیرہ کے ناموں سے مشہور تھے۔ اور اب نیشنل عوامی پارٹی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

اس گروہ کے سیاسی اخلاص اور بصیرت پر اعتراض یقیناً وارد ہوتا ہے کہ وہ خان قیوم کی سیاسی حکمت عملیوں اور ان کی سازشوں کو سبوتاژ نہیں کر سکے۔ اس کے برعکس شدید رد عمل اور غم و غصے کے جواز میں انہوں نے دانستہ اپنے آپ کو وہی کچھ ثابت کرنا شروع کر دیا۔ جو کچھ خان قیوم کا منشا تھا اور اس طرح انہوں نے خان قیوم کو کمزور کرنے کے بجائے پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیا۔ ۲۳ سال گزر جانے کے باوجود، ملک کے سیاسی اور معاشی تقاضوں کی تبدیلیوں کے باوجود آج بھی خان قیوم اپنے اس حریف گروپ کو پاکستان کا دشمن غیر وفادار اور بھارتی ایجنٹ ثابت کرنے میں مصروف ہیں جبکہ یہ گروپ اپنی جگہ خود بھی یہ ثبوت فراہم کر رہا ہے کہ خان قیوم کا ارشاد بجائے درست ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کے سہارے زندہ رہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ یا پھر یہ کہ اس صوبے کے عوام کو ایک دوسرے کی مخالفت میں استعمال کر کے ان کی طبقاتی جد و جہد کو سبوتاژ کرنے میں مصروف ہوں۔

(ب) جاگیرداروں اور کٹھ ملاؤں کے جوڑ توڑ کی داستان بھی اپنی جگہ ایک المیہ ہے۔ ان دونوں کا تاریخی طور پر ایک دوسرے سے بڑا گہرا اور پرانا تعلق ہے، جو اب تک قائم ہے اور جو سوشلزم کے نفاذ تک یقیناً قائم رہے گا۔ کیونکہ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کے بغیر یہ چل ہی نہیں سکتے۔ اس صوبے کے جاگیردار نظریاتی سطح پر ایک دوسرے کے حریف ہونے کے باوجود طبقاتی سطح پر ایک دوسرے کے بہترین حلیف ہیں۔ یہ بات صوبہ سرحد ہی نہیں ہر جگہ صادق آتی ہے۔ کیونکہ اصل بات ہی یہی ہے، چونکہ یہ صوبہ بنیادی طور پر زرعی پیداواری صوبہ ہے اور پیداوار کے تقریباً تمام وسائل پر بڑے بڑے جاگیرداروں کا قبضہ ہے۔ اس لئے زراعت پیشہ افرادی قوت اپنی بے بسی اور بے چارگی کی وجہ سے اصولی طور پر انہی جاگیرداروں کے قبضہ میں ہے۔ یہ لازمی بات ہے کہ یہ جاگیردار جس جماعت میں شامل ہوں گے انہیں ووٹ حاصل کرنے میں دشواری نہ ہوگی۔ اسے پیپلز پارٹی کی خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی کہ اول تو اس کو اس صوبے میں بہت کم جاگیردار اور زمیندار دستیاب ہوئے۔ اور جو دستیاب ہوئے وہ اتنے زیادہ صاف دل تھے کہ انہوں نے نظریاتی منافقت کے بجائے اپنے طبقاتی فریضے کے اظہار کو فوقیت دی۔ پیپلز پارٹی کو سندھ کی طرح یہاں جاگیردار کیوں نصیب نہیں ہوتے، اس کی ایک بنیادی وجہ ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ اس صوبے میں پیپلز پارٹی کی صوبائی قیادت کے لئے ذوالفقار علی بھٹو نے جس زمیندار کو منتخب کیا تھا وہ اپنی اراضی اپنے سیاسی تجربے اور اپنی عمر تینوں کے اعتبار سے جاگیرداروں کے طبقاتی اصولوں کے مطابق اس بات کا اہل نہ تھا کہ زیادہ اراضی، زیادہ سیاسی تجربے اور زیادہ عمر والے خوانین اس کی قیادت میں سیاست کا سفر شروع کرتے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لئے وہی دو گروہ منتخب کئے جن کا پہلے ذکر کیا جا چکا ہے یعنی قیوم لیگ اور نیپ، وہ جاگیردار جو پیپلز پارٹی کی مقبولیت کو اقتدار کا زینہ سمجھ کر اس میں شامل ہوتے تھے، بزعم خود اقتدار پر فائز ہو چکے تھے۔ پیپلز پارٹی کے معاشی پروگرام اور اس کے نعروں سے قطع نظر انہوں نے بعض ایسی حرکتیں کیں جو ان سے بعید تو نہ تھیں لیکن اس کی وجہ سے ان کی منافقت کا پردہ چاک ہو گیا۔ اور لوگ ان کے اصل روپ

قیوم خان کا دعویٰ ہے کہ وہ پاکستان کے خالق ہیں اور وہ اسی دعوے کی بنیاد پر پاکستان کے خاتمے تک قیادت اور سیادت کا حق طلب کرتے ہیں

الفتح

ڈیرہ اسماعیل خاں، مفتی محمود کے فتووں کی راجدھانی ہے

کو سمجھ گئے۔ اگر کوئی جاگیردار جاگیرداری کے خاتمے کا نعرہ لگائے تو اس کی بات کو کم از کم جذباتی اعتبار سے سچ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس نعرے کے ساتھ ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے کسانوں پر گولیاں برسائے تو شاید ہی کوئی دلیل دنیا میں موجود ہو جو اس کے خلوص نیت کو ثابت کر سکے۔ چارسدہ کے علاقے میں ایسے ہی واقعات رونما ہوئے تھے جن کی بدولت پیپلز پارٹی ناکام ہوئی اور اس کی ناکامی کا براہ راست ان لوگوں کو فائدہ پہنچا جو خود بھی گولیاں چلانے والوں کے بھائی بند تھے۔ صرف اتنا فرق تھا کہ وہ گولیاں چلاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے نہ گئے تھے۔

سوات، دیر اور چترال کے علاقے نہ صرف جاگیرداروں کے سب سے مستحکم علاقے ہیں بلکہ ریاستوں کے خاتمے سے بہت پہلے ہی سے ان پر مذہبی گروہوں کا تسلط بھی قائم ہو چکا تھا سوائے ریاست سوات کے کہ جہاں سیاسی شعور تھوڑا بہت بیدار ہے، دیر اور چترال کے علاقے مکمل طور سے خوانین، نوابوں اور کٹھ ملاؤں کے قبضے میں ہیں۔ سوات میں پیپلز پارٹی کے امیدوار جاگیردار نہ ہونے کے باوجود بہت کم ووٹوں سے ہارے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خاں کے قرب و جوار کا علاقہ مکمل طور سے مفتی محمود کے فتووں کی راجدھانی کہلاتا ہے۔ ان علاقوں کے عوام بیسویں صدی میں بھی تیسری چوتھی صدی کے انسانوں سے مشابہت رکھتے ہیں جن کی اول تو تعلیم سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر کوئی صاحب علم ہے بھی تو وہ کسی دارالعلوم کا ڈگری یافتہ ہے۔ اس صوبے میں جس قدر دارالعلوم ہیں اگر انہی کے برابر کارخانے ہوتے تو اس صوبے کا سیاسی مزاج بہت مختلف ہوتا۔ لیکن یہ ایک بدقسمتی ہے جس کی تلافی نہ تو پیپلز پارٹی کے بس کی بات ہے نہ ان غریب عوام کے بس کی بات ہے جو اپنی بے انتہا کوششوں کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو سے خراج تحسین حاصل نہ کر سکے۔

(ج) صوبہ سرحد کی نوکر شاہی نے حالیہ انتخابات میں وہی کردار ادا کیا ہے جو مشرقی پاکستان کی نوکر شاہی نے انجام دیا تھا۔ مشرقی پاکستان کی نوکر شاہی کا کردار اس حد تک ضرور ترقی پسندانہ تھا کہ اس نے دوسری جماعتوں کے مقابلے میں عوامی لیگ کو ترجیح دی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ مشرقی پاکستان کی نوکر شاہی نے یہ کردار در اصل مغربی پاکستان کی نوکر شاہی سے انتقام لینے کے ادا کیا تھا بالکل اسی طرح جس طرح بنگالی سرمایہ داروں نے مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں سے انتقام لینے کے

سوات میں پیپلز پارٹی کو ایک اچھی قیادت نصیب ہوئی لیکن اس میں سابق ولی عہد اور انتظامیہ کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی

لئے مجیب الرحمن کی اعانت کی۔ صوبہ سرحد کی نوکر شاہی نے جو کردار انجام دیا ہے وہ سارے صوبے میں مختلف تھا، اگر ساری نوکر شاہی کا مزاج ایک جیسا ہوتا تو اس کا نتیجہ بھی ایک جیسا ہوتا یعنی کوئی ایک پارٹی واضح اکثریت حاصل کرتی سیاسی مزاجی اور جغرافیائی تفاوت کا مسئلہ نوکر شاہی کی پسند و ناپسند پر اسی طرح مسلط رہا جس طرح عوام کی تقسیم پر۔ نوکر شاہی کے ایک حصے نے یہاں نیپ کی مدد کی۔ اور دوسرے حصے نے قیوم لیگ کی معاونت کی۔ اکثر سیاسی حلقوں کی طرف سے قیوم لیگ اور پولیس کے گٹھ جوڑ کا انکشاف کیا گیا۔ صوبے کی وزارت اعلےٰ کے ۴ سالہ دور اقتدار میں

خان قیوم اور پولیس کے محکمہ کی مفاہمت، اور شیر و شکر کی داستانیں کچھ اتنی مشہور ہوئی تھیں کہ اکثر اس بات کا شبہ کیا جاتا تھا کہ صوبے کے اصل وزیر اعلےٰ آئی جی پولیس ہیں۔ یا پھر خان قیوم در اصل آئی جی پولیس ہیں۔ صوبہ سرحد کو ''پولیس اسٹیٹ'' کا لقب انہی دنوں میں ملا تھا۔ اور انہی دنوں کی یادگار حالیہ انتخابات میں بھی قائم کی گئی۔ پرانے رشتے بحال ہوتے محسوس کئے گئے۔

پاکستان میں پچھلے ۲۳ سالوں میں نوکر شاہی ایک طبقے کے طور پر جس تیزی کے ساتھ ابھری ہے وہ ایک المناک حقیقت ہے۔ لوٹ کھسوٹ کے اس طویل دور میں نوکر شاہی نے لٹنے والوں اور لوٹنے والوں کے درمیان کمیشن ایجنٹوں کا جو رول ادا کیا ہے نوکر شاہی نے ریاستی مشینری کے تاریخی مزاج کی نہ صرف توثیق کی بلکہ اپنے اختیارات کی کھیتی سے مطلوبہ فصل بھی کاٹی۔ اس کی راہ میں ایسی کوئی دشواری بھی نہ تھی جو اسے روک سکتی۔ بدلتے ہوئے سیاسی اور اخلاقی ماحول میں اس کا مستقبل بھی اتنا ہی تاریک تھا جتنا کہ استحصالی طبقوں کا چنانچہ انہوں نے اپنی غیر جانبداری کا ہنر صرف اسی طبقے کے تحفظ کے لئے استعمال کیا جن سے انہیں جیسی کی توقع تھی۔ انہوں نے کھلم کھلا انہی افراد کے مفادات کو عزیز سمجھا۔ جن کی بدولت ان کے مفادات محفوظ رہ سکتے تھے۔ دیر، سوات اور چترال میں پاکستانی انتظامیہ کے ساتھ سابق ریاستی انتظامیہ بھی اس کھیل میں برابر کی شریک تھی۔ ان علاقوں میں اصل کھیل ریاستی عہد کی انتظامیہ نے کھیلا۔ پاکستانی حکام نے محض بزرگانہ سرپرستی کے فرائض سر انجام دیئے۔

صوبہ سرحد کے سیاسی مزاج اور اس کی تقسیم نیز مقامی تضادات کے بعد سب سے اہم بات پیپلز پارٹی کا اپنا کردار ہے۔ جس کا عکس گزشتہ انتخابات میں دیکھنے میں آیا ہے۔ اسے بدقسمتی کہئے، یا قحط الرجال کہئے۔ مگر یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ کہ پیپلز پارٹی کو صوبہ سرحد میں موثر قیادت نصیب

ٹکٹوں کی تقسیم اصولوں کی بجائے تعلقات کی بنیاد پر ہوئی

نہیں ہو سکی۔ پیپلز پارٹی کو اس صوبے میں جو قیادت میسر آسکی تھی اس کے خلوص پر اگر شک نہ کیا جائے تو بھی سیاسی تجربے کے فقدان اور بروجہ بورژوا سیاسی ہتھکنڈوں سے اس کی بے خبری نے پیپلز پارٹی کی ناکامی میں ایک اہم کردار انجام دیا۔ پورے صوبہ سرحد میں سوائے ڈیرہ اسماعیل خاں کے پیپلز پارٹی کو کسی بھی جگہ عوامی قیادت نصیب نہ ہوئی اور وہ قیادت بھی سردار حق نواز گنڈاپور کی زندگی تک ہی محدود تھی ان کی آنکھیں بند ہونے کے بعد کوئی دوسرا شخص ان کی جگہ نہ سنبھال سکا۔ ہزارے میں پیپلز پارٹی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مردان اور اس کے ملحقہ علاقوں میں اگرچہ ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو نظریاتی طور پر انقلابی فلسفوں سے آگاہ تھے۔ لیکن یہ بات محسوس کی گئی کہ وہ لوگ جس طرح کہ وہ چاہتے تھے کام نہ کر سکے۔ اور مردان میں ایک عرصہ تک کسی خفیہ ہاتھ نے پارٹی کو متحد اور متفق نہ رہنے دیا۔ سوات میں پیپلز پارٹی کو ایک اچھی قیادت نصیب ہوئی تھی۔ لیکن اس میں سابق ولی عہد اور انتظامیہ کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ چارسدہ میں قیادت جس خوش نصیب کے ہاتھ لگی تھی اس نے صرف پیپلز پارٹی کے پروگرام اور اس کے منشور کی دھجیاں بکھیر ڈالیں بلکہ کسانوں پر تشدد کرکے پیپلز پارٹی میں چھپی ہوئی کالی بھیڑوں کی نشاندہی بھی کر دی۔ جس کی وجہ سے اس علاقے کے کسانوں کی اکثریت نے ووٹ کا حق استعمال ہی نہیں کیا اور یوں یہ نشست ولی خان کے ہاتھ چڑھ گئی۔

ان انتخابات میں پیپلز پارٹی قومی اسمبلی کی ۱۸ میں سے ایک نشست پر اور صوبائی کی ۴۰ میں سے ۳ نشستوں پر کامیاب ہوئی تھی۔ مردان سے قومی اسمبلی کی جس نشست پر پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی وہ ناممکن سی بات تھی۔ ہوتی کے نواب کے مقابلے میں مردان کے کسانوں نے پیپلز پارٹی کے امیدوار کو کامیاب کرکے اس تصور کا ثبوت دیا کہ اگر دوسرے علاقوں میں بھی کسانوں کے ساتھ نظریاتی سطح پر رابطہ رکھا جاتا تو اس کے نتائج میں بھی پیپلز پارٹی کے امیدوار کی جیت کی وجہ یہی تھی مالاکنڈ ایسے ہی نکلتے۔ اس علاقے سے صوبائی اسمبلی کی بھی ایک نشست پیپلز پارٹی کے حصے میں آئی مالاکنڈ میں کے امیدوار نے جو ایک چھوٹا زمیندار ہے اپنے کسانوں کو اس غلامی سے بہت حد تک آزاد کر رکھا تھا جو صدیوں سے ان کا مقدر بنی ہوئی تھی۔ اسی کے نتیجے میں بڑے زمینداروں اور خوانین کے کسانوں میں طبقاتی احساس پیدا ہوا۔ اور نہ صرف وہ کسان ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے بلکہ انہوں نے اپنے خوانین کا بھی ناطقہ بند کر دیا۔ جن کے ہاتھوں ان کی زندگی اجیرن تھی۔ پشاور کی نشست پر پیپلز پارٹی کے صوبائی آرگنائزر خود کامیاب ہوئے اسی جگہ سے وہ قومی اسمبلی کے انتخابات میں قیوم خان کے ہاتھوں شکست کھا گئے تھے۔ لیکن صوبائی انتخابات میں نیپ ولی گروپ نے خان قیوم کی دشمنی میں پیپلز پارٹی کے امیدوار کے حق میں اپنے امیدوار کو دستبردار کرکے پیپلز پارٹی کو کامیابی کا موقع فراہم کر دیا اور اس طرح خان قیوم، جماعت اسلامی کونسل لیگ، کنونشن لیگ اور نہ جانے کتنی لیگوں

صوبائی قیادت پیپلز

پارٹی کی ناکامیوں کی

تمام تر ذمہ داریاں

دوسروں پر

ڈالنے کی بجائے خود

تنقیدی سے کام لے

کے تعاون کے باوجود ہار گئے۔

صوبے کے باقی حصوں میں جیسا کہ نتائج سے ظاہر ہے پیپلز پارٹی کسی بھی جگہ کامیاب نہ ہوئی۔ اگر اس انتخابی جنگ کا شروع سے آخر تک مفصل تجزیہ کیا جائے تو اس کے لئے کافی وقت درکار ہوگا۔ مختصر طور پر جو چند باتیں محسوس ہو سکی ہیں ان میں قابل ذکر باتیں یہ ہیں کہ (۱) ٹکٹوں کی تقسیم کا کام اصولوں کی بجائے تعلقات کی بنیاد پر ہوا۔ یہ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش نہ کی گئی کہ ٹکٹ لینے والے کو اس حلقے میں کتنے لوگ پسند کرتے ہیں اور اس کا اپنے عوام میں کیا عمل ہے۔ (۲) عوام سے رابطہ مہم میں تاخیر۔ (۳) پیپلز پارٹی کو طبقاتی سیاست سے الگ کرکے بورژوا خطوط پر چلانے کی کوشش (۴) جنوری ۱۹۷۰ء سے اکتوبر ۱۹۷۰ء تک کا وقت انتخابی تیاری اور عوام کی تنظیم کی بجائے پارٹی میں گروہی سازشوں کی نذر ہوا (۵) پنجاب اور سندھ سے معقول اور پڑھے لکھے افراد کو جلسوں میں بلانے سے گریز کہ مبادا لوگ سائنسی انداز فکر اختیار کر لیں۔

یہ بات بھی شدت سے محسوس کی گئی کہ پارٹی کے صوبائی سربراہ طبقاتی سیاست تو در کنار بورژوا سیاست کے اصل و اصول سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ وہ سیاست کے ان نشیب و فراز سے پوری طرح واقف نہیں لگتے۔ جو تنظیمی صلاحیتوں کے لئے ازبس ضروری ہوتے ہیں۔ اگر وہ تھوڑا سا بھی سائنسی انداز فکر اپناتے اور اسلامی سوشلزم ہی کے اصولوں پر عمل درآمد کرتے تو ورکروں کی ایک بہت بڑی فوج سے یہ جنگ جیتی جا سکتی تھی۔ اس جنگ کے جیتے جانے سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوتا کہ یہ صوبہ پرانے کھنڈرات سے خالی ہو جاتا۔ اور یہاں نوجوان قیادت کی حوصلہ افزائی ہوتی۔

تنظیم نو کے سلسلے میں اگر گروہ بندیوں کو ختم کرنے

باقی صفحہ ۳۰ پر

برما میں امریکی اڈہ قائم کرنے کا منصوبہ



سید محمد سلیمان

جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں سی آئی اے نے ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ دلچسپی لینی شروع کی۔ اس زمانے میں جاپان کے فوجی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے بعد برما دوسری جنگِ عظیم سے پہنچنے والے زخموں کی مرہم پٹی میں مصروف تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اس جانب مبذول تھی کہ ملکی معیشت کو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا کیا جائے۔ لیکن اس زمانے میں برما میں طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا چین کے شاہی خاندان کی فوج جو ماؤزے تنگ کی عوامی فوج سے شکست کھا کر برما بھاگ آئی تھی برمی حکومت کے لئے دردِ سر بن گئی تھی۔ اس فوج نے ملک میں قتل و غارت، لوٹ مار اور افیون کی ناجائز تجارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

چنانچہ ان حالات کو سی آئی اے نے اپنے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا اور برما میں اپنے قدم جمانے کے لئے ان سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ سی آئی اے نے اس فوج کو خوراک اور سامانِ حرب مہیا کرنا شروع کر دیا۔ ہر امریکی طیارہ فوجی ساز و سامان اور رسد کے علاوہ امریکی مشیروں کی ایک کھیپ بھی لاتا تھا۔ یہ امریکی مشیر اس لئے بھیجے جاتے تھے کہ ہند چینی کی اقوام کی جدوجہد آزادی کو سبوتاژ کرنے کے لئے اس فوج سے کام لیں۔ امریکی مشیروں نے اس فوج کی مدد سے برما کے صوبہ کینگ تنگ پر قبضہ کر لیا اور پھر اس صوبے میں "آزاد حکومت" بھی قائم کر لی۔ امریکہ کا پلان یہ تھا کہ اس صوبے میں امریکی فوجی اڈہ قائم کر کے روس اور چین کی نگرانی کی جائے۔

لیکن برما کی حکومت امریکہ کے ان اقدامات کی شدید مخالف تھی۔ وہ اپنے علاقے کو غیر ملکی حملہ آوروں سے آزاد کرانا چاہتی تھی اور اپنے ملک کے لئے سود مند پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی خواہشمند تھی۔ برما میں امریکی سفیر ولیم سیبالڈ نے اپنی حکومت کو خبردار بھی کیا کہ قوم پرست چین کی مفرور فوج برما کی آزادی کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ لہٰذا ایک دوست ملک کی مدد کرتے ہوئے امریکہ کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس فوج کو فارموسا واپس بھیج دیا جائے۔ لیکن اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس کو حقیقی پالیسی سے نابلد رکھا اور یہ جواب دیا کہ یہ برما کا اندرونی معاملہ ہے۔ امریکی حکومت اس میں دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ ولیم سیبالڈ نے اس جواب سے برما کی افواج کے سربراہ جنرل نی ون کو مطلع کر دیا۔ لیکن جنرل نی ون کو حقیقت کا بخوبی علم تھا۔ اس نے سیبالڈ کو سخت سست کہا۔ اور واشگاف الفاظ میں سیبالڈ پر واضح کر دیا کہ امریکہ اس کے ملک کی سلامتی کے درپے ہے۔ اور بغل میں چھری رکھ کر منہ سے رام رام کا ورد کر رہا ہے۔

جب برمی حکومت امریکہ سے پے در پے درخواستوں کے بعد کسی بھلائی سے نا اُمید ہو گئی تو اس نے بالآخر یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں پیش کر دیا۔ لیکن یہاں بھی امریکہ نے اپنے حواری سامراجی ممالک کے تعاون سے اس کی درخواست پر عمل نہ ہونے دیا۔ جب برما کی حکومت نے تیسری مرتبہ اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو امریکی حکومت کو جھکنا پڑا کیونکہ سوویت یونین نے امریکہ کو آگاہ کر دیا تھا کہ اگر برما کے علاقے چینی قوم پرستوں کی افواج سے خالی نہ کرائے گئے تو سوویت یونین برما کی حمایت میں عملی اقدامات کرے گا۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر ہو گی۔

اس مسئلے کی بین الاقوامی پیچیدگیوں اور نزاکت کے پیش نظر سی آئی اے کو بادل ناخواستہ اس فوج کو تائیوان واپس بھیجنے پر رضامند ہونا پڑا۔ جنوری ۱۹۶۱ء میں اس فوج کا انخلاء مکمل ہوا۔

برما کے علاقے خالی کرنے کے بعد بھی اس فوج نے امریکہ کے لئے کئی مشکلات کھڑی کر دیں۔ اس فوج کے چھوڑے ہوئے علاقوں میں برما کی افواج نے وہ سامانِ جنگ برآمد کر لیا جو سی آئی اے

نے اُن کی مدد کے لئے بھیجا تھا۔ یہ اسلحہ سے بھرے ہُوئے پانچ صندوق تھے جن پر امریکی امدادی پروگرام کا مونوگرام۔ مصافحہ کرتے ہُوئے دو ہاتھ ثبت تھے۔ اس انکشاف سے کہ امریکہ فوجی امداد سے قوم پرست فوج کی پشت پناہی کر رہا تھا، برما میں کھلبلی مچ گئی۔ ہزاروں افراد نے رنگون میں امریکی سفارت خانے پر حملہ کرکے عمارت کو سخت نقصان پہنچایا۔ پولیس کو مظاہرین کو منتشر کرنے کے لئے گولی چلانی پڑی جس سے کئی افراد ہلاک ہو گئے۔ لیکن حالات اتنے بگڑ گئے کہ فوج کو طلب کرنا پڑا۔

دُوسری طرف بین الاقوامی سطح پر بھی امریکہ کو ہدفِ تنقید بنایا جا رہا تھا۔ اپنی معصومیت ثابت کرنے کے لئے امریکہ نے اعلان کیا کہ وہ اس سلسلے میں تفتیش کرے گا اور پھر جاپان میں کے لئے تین اعلیٰ فوجی افسروں پر مشتمل ایک وفد رنگون بھیجا گیا ان فوجی افسروں نے تو ستم ظریفی کی حد کر دی۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں کہا "اسلحے کے صندوقوں پر امریکی امدادی پروگرام کے جعلی نشان لگائے گئے ہیں" مزید سراغرسانی کے لئے انھوں نے وہ صندوق واشنگٹن بھجوا دیئے۔ امریکہ کے اس عذرِ لنگ کو برما نے تسلیم کیا اور نہ ہی عالمی رائے عامہ نے۔ دنیا بھر کے اخبارات نے اس کذب بیانی پر امریکہ کو کڑی نکتہ چینی کا نشانہ بنایا۔ اس موقعے پر امریکی سفیر سیبالڈ نے اپنی حکومت کو مشورہ دیا کہ "وہ اس امر کا اعلان کر دے کہ یہ اسلحہ امریکہ نے فارموسا کو دیا تھا جو اس نے اس فوج کے حوالے کر دیا۔ لہٰذا اس سلسلے میں امریکہ فارموسا سے باز پرس کرے گا" چنانچہ امریکی حکومت نے ایسا ہی کیا۔ فارموسا نے یہ الزام ماننے سے انکار کر دیا۔ اس طرح امریکہ کے لئے نئی مشکلات کا سامان پیدا ہو گیا۔ اب دنیا بھر میں امریکہ کا مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف برما کی حکومت امریکہ سے سخت بدظن ہو گئی۔

برما کے سربراہ جنرل نی ون نے جب یہ دیکھا کہ امریکہ نے اُن کے ملک کی آزادی کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی تو وہ امریکہ اور اس کے سرمایہ دارانہ نظام سے سخت نفرت کرنے لگے۔ انہوں نے عوامی جمہوریہ چین اور سوویت یونین کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اپنی معیشت میں دوررس تبدیلیاں کیں۔ سوشلزم کو اپنا منتہائے مقصود قرار دے کر اس کی بنا چاول کی صنعت کو قومی ملکیت میں لے کر کی۔ پھر بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ جنرل نی ون نے معاشی منصوبہ بندی کے لئے عوامی جمہوریہ چین سے تین سو ماہرین کو بلایا۔ اور چین سے آٹھ کروڑ ڈالر کا قرضہ بھی حاصل کیا۔ اس طرح وہ سرمایہ دارانہ بلاک کی دوست نما دشمنی سے بالکل الگ ہو گئے۔

۱۹۴۸ء میں جب برما نے مغربی جمہوریت کا تجربہ شروع کیا تھا۔ وہ ۱۹۶۳ء میں اشتراکی بلاک کا دوست بن گیا۔ کیونکہ اشتراکی ممالک نے مشکل وقت میں اس کی مدد کی تھی۔ جب کہ اس کے نام نہاد دوستوں نے بروٹس کا کردار ادا کرتے ہُوئے اس کی آزادی سلب کرنے کی کوشش کی تھی۔

اگر ہم ان اسباب و علل کا بین الاقوامی امور کے طالب علم کی حیثیت سے جائزہ لیں، جنھوں نے سی آئی اے کو اس علاقے میں گہری دلچسپی لینے پر اُکسایا تو ہم پر یہ راز منکشف ہوگا کہ اس کا واحد مقصد برما کو بدنام زمانہ معاہدہ سیٹو میں شریک کرنا تھا تاکہ یہ ملک بھی اشتراکی ممالک کے گرد حصار کا کام دے سکے۔ اس بات کی تصدیق سیٹو کے تیسرے سالانہ اجلاس میں ہونے والی بحث سے بھی ہو جاتی ہے جو ۱۹۵۷ء میں آسٹریلیا کے صدر مقام کینبرا میں ہُوا تھا۔ اس اجلاس میں اس امر پر بھی غور و خوض کیا گیا تھا کہ برما کو اس معاہدے کا ممبر بننے پر کس طرح مجبور کیا جائے۔

سی آئی اے اپنی اس سازش میں نہ صرف ناکام رہی بلکہ اس کی مذموم سرگرمیوں نے اس علاقے میں امریکہ کے دوستوں کی فہرست میں ایک کی کمی کر دی اور اشتراکی ممالک کی صفیں مضبوط کر دیں۔ سی آئی اے برما میں اتنی بدنام ہو چکی تھی کہ رنگون میں لوگ معمولی حادثات و واقعات مثلاً طوفان کا آنا۔ اور بجلی فیل ہو جانے کو سی آئی اے کی سازش قرار دیتے تھے۔ برما میں سی آئی اے کی ناکامی نے اس بات پر مہر تصدیق ثبت کر دی کہ نادان دوست کتنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

نعرۂ انقلاب

اعزاز احمد آذر

خونِ مزدور کی
سانجھو ہے قسم
ہو بلند اور بھی
حریت کا علم

تم بڑھائے چلو
تیز تر یہ قدم
پھر حقیقت بنے
اپنا دیرینہ خواب

انقلاب انقلاب
انقلاب انقلاب

ایک دو پل کی اب
دوستو بات ہے
بس ڈھلی اب ڈھلی
ظلم کی رات ہے

ان اندھیروں کو اب
ہوگئی مات ہے
وہ اُفق سے اُٹھا
اک نیا آفتاب

انقلاب انقلاب
انقلاب انقلاب

اب نہ ہم پہ چلے
ظالموں کا فسوں
ان کے دامن پہ ہے
آدمیت کا خوں

آج تم بھی کہو
آج میں بھی کہوں
سو سوال اک جواب

انقلاب انقلاب
انقلاب انقلاب

جواب دو

مختار حیات

کس نے اڑائیں عظمتِ آدم کی دھجیاں
کس نے مٹایا جنسِ وفا کا نشاں نشاں
کس کے کرم سے خاک ہوئیں جل کے بستیاں
ایماء پہ کس کے لٹتے رہے روز کارواں
بھڑکائے شعلے کس نے زمیں تا بہ آسماں
کس نے کیا ہے گلشنِ ہستی دھواں دھواں

●

دیوارِ رنگ و نسل کی تعمیر کس نے کی
اور ابتدائے نفرت و تحقیر کس نے کی
غربت ہمارے نام پہ تحریر کس نے کی

●

کس نے یہ چند لوگوں کو ڈالر میں تول کر
کس نے فضا میں زہر فقط زہر گھول کر
ہر سمت ایک آگ کا دریا بہا دیا
انساں کا خون اور بھی ارزاں بنا دیا

●

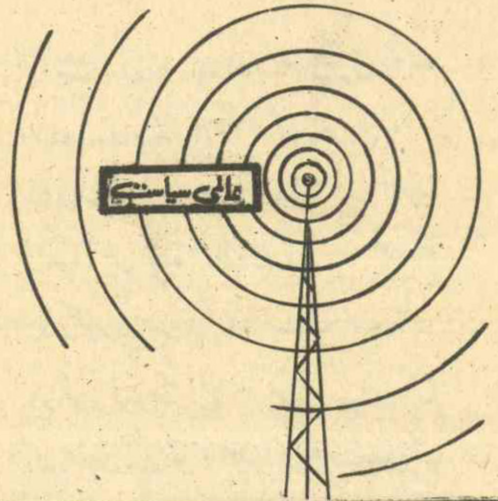
کروٹ بدل رہا ہے وہ دیکھو پھر آج وقت
انساں نے اپنا ذہن جھنجھوڑا پھر ایک بار
انسان خاک و خون میں لتھڑا ہوا اٹھا
ہاتھوں میں اپنے امن کا پرچم لئے ہوئے
وہ دیکھو پھر طلوع ہوا آفتابِ نو
وہ نور نور سرخ سویرا عیاں ہوا
اِک انقلابِ نو کا پھریرا عیاں ہوا

●

اے صاحبانِ جُبّہ و دستار و کج کلاہ
کم ظرف و کج خیال و کج احساس و کج نگاہ
سبحہ بدست دوش بہ زُنّار رہزنو
سوداگرانِ مذہب و ایمان رہبرو
ڈالر بہ جیب دست بہ قرآن عالمو
جو کچھ بھی پوچھتا ہے یہ انساں جواب دو
خود ساختہ جہاں کے خداؤ — جواب دو
رُخ سے نقاب اپنے ہٹاؤ — جواب دو
تم اپنی اصل شکل میں آؤ — جواب دو
اب منہ میں انگلیاں نہ دباؤ — جواب دو
خنجر نہ اب عبا میں چھپاؤ — جواب دو
مارا جنہیں ہے ان کو بلاؤ — جواب دو
دنیائے سیم و زر کے خداؤ — جواب دو
ظلمت بدوش راہنماؤ — جواب دو
کمخواب پوش و سیم رداؤ — جواب دو
دار و رسن کی سمت بھی آؤ — جواب دو

بھارت میں فسادات کے ذمہ دار سامراج

نائیجیریا سے چین کی



لاؤس

جنوبی ویتنام کے مشہور کمانڈر جنرل ڈو کاو ٹری کے ہلاک ہونے سے جنوبی ویت نام کی فوجوں میں سخت اضطراب پھیل چکا ہے۔ لاؤس میں شاہراہِ ہوچی منہ کے محاذ پر حریت پسندوں نے جنوبی ویت نام کی پندرہ ہزار فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ اس کے علاوہ لاؤس میں چھ میل اندر جنوبی ویت نام کی رینجر بٹالین کو باقی فوج سے کاٹ دیا گیا۔ جنوبی ویت نام کی فوجوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ دریں اثنا شمالی ویت نام کے حریت پسند فوج نے لاؤس کے دارالحکومت سے پندرہ میل دور ایک گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ اور ان کے چھاپہ مار دستوں نے دارالحکومت کو ملانے والے تمام پلوں کو تباہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی ایک فضائی اڈے کو شدید نقصان پہنچایا، اور ہوائی اڈے کی عمارت کو تباہ کر دیا۔ اس جنگ میں جنوبی ویت نام کے دو سو سے زائد فوجی ہلاک اور سیکڑوں زخمی ہوئے۔

۸ فروری کو لاؤس پر امریکی پٹھو حکومت کے صدر تھیو کے حکم پر حملہ کیا گیا تھا۔ جنوبی ویت نام نے امریکی فوجوں کے علاوہ امریکی فضائیہ کے طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کے اشتراک سے لاؤس پر حملہ کیا تھا۔ اس حملہ کا مقصد دہ ہوچی منہ جو کہ شمالی ویتنام لاؤس اور کمبوڈیا کے درمیان اہم راستہ ہے۔ شمالی ویت نام کے حریت پسندوں کی سپلائی لائن کو تباہ کرنا تھا۔ یہ فوجیں دریائے ڈونگ کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنا شروع ہو گئیں۔ اس حملہ میں امریکہ نے جنوبی ویت نامی فوجوں کی امداد کے لئے اپنے خاص چھاتہ بردار "گرین بریٹس" جنوبی ویت نامی سرحد کے قریب اتار دیئے۔ اس کے علاوہ لاتعداد فوجی دستے بھیجے جو سائیگی کے فوجیوں کی وردیوں میں ملبوس اور جدید ترین اسلحہ سے لیس تھے۔

دریں اثنا شمالی ویت نام کی حکومت نے لاؤس پر امریکی حملہ کی سخت مذمت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ شمالی ویت نام کی حکومت نے ہر ممکن کوشش کی کہ ویت نام کی جنگ کا دائرہ لاؤس تک وسیع نہ کیا جائے۔ مگر امریکہ نے انتہائی مکاری سے لاؤس کی خود مختاری کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جنوبی ویتنام کے دس ہزار کرائے کے فوجی لاؤس میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور اس حملے میں خودکار ہتھیار۔ مارٹر توپوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور اس دوران امریکی فضائیہ کے طیارے جنوبی ویت نام کی فوج کی چوری چوری امداد کر رہے ہیں۔

لاؤس کے حریت پسندوں نے امریکہ کی جارحانہ کارروائیوں پر شدید احتجاج کیا ہے۔ اور جنیوا کانفرنس کے چیئرمینوں سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ امریکہ کو ان کارروائیوں سے باز رکھیں۔ اس کے علاوہ امریکہ کے کئی شہروں میں لاؤس پر امریکی اور جنوبی ویتنام کے حملے کے خلاف زبردست مظاہرے ہوتے لیکن

امریکہ اپنے سامراجی مقاصد کی تکمیل کے لئے برہنہ جارحیت کے مظاہرے میں معروف ہے امریکی صدر نکسن اس گھناؤنی اور انسان کش کارروائیوں کو جنوبی ویتنام میں امریکی فوجوں کے تحفظ اور سلامتی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ جب کہ ویت نام میں امریکی فوجوں کی موجودگی کا امریکہ کے پاس کوئی قانونی جواز نہیں ہے اور امریکی سامراج لاؤس کے علاوہ کمبوڈیا اور شمالی ویتنام میں بھی اپنی جارحانہ کارروائیاں برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اور امریکہ کی سامراجی کارروائیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں اور عالمی سیاست میں اس کے گھناؤنے کردار سے دنیا کا ہر شخص واقف ہو چکا ہے۔

کمبوڈیا

کمبوڈیا کی قوم پرست افواج نے چھام چالیونگ ویل رہین کے علاقہ میں لون نول کے ایک بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس حملہ میں دشمن کے تقریباً ایک ہزار فوجی گرفتار اور ۲۸ فوجی گاڑیاں تباہ ہوئیں۔ ۱۳ جنوری اور ۱۵ جنوری کے درمیان وطن پرستوں نے سائیگانی فوجوں کی دو گوریلا بٹالین، دو بکتر بند دستوں اور میرین کی ایک کمپنی تباہ و برباد کر دی اور ۳۶ بکتر بند گاڑیوں کو نذرِ آتش کر دیا۔

کمبوڈیا کی قومی فوج کی پیش قدمی کی وجہ سے سائیگان کی امریکہ نواز فوجوں کو پسپا ہونا پڑا۔ ان کی پسپائی کے نتیجے میں شاہراہ نمبر چار کے بیشتر حصوں پر وطن پرستوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ حریت پسندوں نے دریائے میکانگ پر تابڑ توڑ حملے کر کے کئی فوجی کشتیوں کو تباہ و برباد کر دیا، اور کمبوڈیا کے دارالحکومت

ہیں

ستی کے نتیجے میں جنوبی افریقہ کو اسلحہ مل رہا ہے

اور سائیگان کے درمیان فوجی نوعیت کے رابطہ کو درہم برہم کر دیا۔

حریت پسندوں نے فونگ چھام، سے رینگ، پرے ونگ، کیمپاٹ، ٹے کیو، کاندال، کام فونگ تھام اور باٹم بنگ کے صوبوں میں بھی اپنی پیشقدمی جاری رکھی۔ نوں نول کی ایک سو ستر ستھویں بٹالین کے تین سو فوجی مار ڈالے اور چھ فوجی گاڑیوں پر قبضہ کر لیا۔ کمبوڈیا کے حریت پسند امریکی سامراج اور فون نول کی بیٹھو حکومت پر پے در پے ضربیں لگا رہے ہیں اور ان کی پیش قدمی جاری ہے۔

جنوبی افریقہ کو اسلحہ کی فراہمی

جنوبی افریقہ کو تارپیڈو بردار ہیلی کاپٹر اور ہتھیاروں کی فروخت کے اعلان نے برطانوی سامراج کے عوام دشمن عزائم کو عیاں کر دیا ہے۔ اس اعلان سے ثابت ہو گیا ہے کہ بیسویں صدی کے اس آخری دور میں بھی برطانیہ نوآبادیاتی نظام کا حامی ہے۔ اس فیصلے سے دولت مشترکہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ گھانا نے لندن سے اپنے ہائی کمشنر کو بلا لیا ہے۔ نائجیریا نے دولت مشترکہ کی خصوصی مطالعاتی کمیٹی سے نکل جانے کی دھمکی دی ہے۔

دولتِ مشترکہ کی حالیہ کانفرنس میں جنوبی افریقہ کو ہتھیاروں کی فراہمی پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے ایک مطالعاتی کمیٹی بھی بنائی گئی تھی۔ لیکن برطانیہ نے اس کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کئے بغیر جنوبی افریقہ کی عوام دشمن حکومت کو ہتھیار دینے کا اعلان کر دیا۔ برطانیہ کے اس اقدام کی فوری وجہ یہ ہے کہ ۱۰ فروری کو نائجیریا



اور عوامی جمہوریہ چین کے درمیان سفارتی تعلقات قائم ہو گئے ہیں۔ اور ان دونوں حکومتوں کا جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا تھا اس میں اعلانیہ طور پر سامراجی اور نوآبادیاتی نظام کی مذمت کی گئی تھی اور

عوامی جمہوریہ چین نے افریقی عوام کی جدوجہد آزادی اور سامراج دشمن تحریک کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا تھا۔ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ افریقی عوام کی تحریکِ آزادی کو سبوتاژ کرنے کے لئے برطانیہ



آزادی وطن کا ایک ہی راستہ ——— مسلح جدوجہد

نے جنوبی افریقہ کو اسلحہ فراہم کرنے کا اعلان کیا ہے۔

بھارت میں مسلم کش فسادات

کلکتہ ، الہ آباد اور احمد آباد کی گلیاں، کوچے اور سڑکیں، ۱۹۴۷ء کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ بازاروں میں مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ بھارتی حکومت ان مسلم کش فسادات کی روک تھام کی بجائے انتخابات میں مصروف ہے۔ بلکہ کشمیری عوام پہ مزید ظلم و تشدد کر کے اور پاکستان کو جارحیت کی دھمکیاں دے کر مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ اور پھیلا رہی



اندرا گاندھی فسادات کی روک تھام میں ناکام رہیں

ہے۔ یہ فسادات کیوں ہو رہے ہیں؟ سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ بھارتی عوام جو ۲۳ سال سے لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا شکار ہیں۔ مذہب اور ملت کی تمیز کئے بغیر متحد ہو گئے ہیں اور ملکی انتخابات میں استحصالی طبقوں اور اُن کے نمائندوں کو پاکستان کے عوام کی طرح عبرت ناک شکست دینے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔ مسلمان محنت کش اور ہندو محنت کش استحصالی نظام کو دفن کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے اجارہ دار سرمایہ دار، زمین دار، اور نوکر شاہی، عوامی طاقتوں کے اس اُبھار سے خائف ہو کر اپنے زرخرید برہمنوں اور پنڈتوں اور علماء کے ذریعے مذہبی جذبات کو ہوا دے کر فسادات کروا رہی ہے تاکہ طبقاتی جدوجہد کو مذہبی عصبیت میں تبدیل کر دیا جائے۔ نوکر شاہی اور پولیس بھی سرمایہ داروں کے اس کھیل میں برابر کی شریک ہے۔ وہ پہلے تو فسادات کرواتی ہے اور پھر بعد میں محنت کشوں کو گرفتار کر کے عوامی اُبھار کو کچلنے کی کوشش کر رہی ہے۔

اس کے علاوہ ہندوستان کی فرقہ پرست جماعتیں جن سنگھ اور راشٹریہ سیوک سنگھ مسلمانوں کی جانی دشمن ہیں۔ انتخابات میں انھیں مسلمانوں کے ووٹ ملنے کی کوئی امید نہیں۔ اس لئے یہ بھی مسلم کش فسادات میں برابر کی شریک ہیں۔

لیکن بھارت میں نکسل باڑی تحریک اور نئی اُبھرتی ہوئی ترقی پسند قیادت کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بھارتی سرمایہ داروں کے اس حربے کو ناکام بنا دیں گے اور عوامی تحریک کی صحیح منزل کی طرف رہنمائی کریں گے۔

یوگنڈا

اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ یوگنڈا میں صدر ابوتے کی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں برطانوی استعماروں کا ہاتھ تھا۔ زمبیا ڈیلی میل لکھتا ہے کہ "حکومتِ برطانیہ وہ پہلی غیر افریقی حکومت ہے جس نے یوگنڈا کی باغی حکومت کو تسلیم کیا۔ برطانیہ کی اس اقدام سے افریقی راہنماؤں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ اور انھیں معلوم ہو جانا چاہیئے کہ برطانیہ طاقت کے ذریعے حاصل کئے ہوئے سیاسی اقتدار کو طاقت کے ذریعے واپس لینے کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے"

نیپال کا ہفت روزہ "ماتری بھومی" لکھتا ہے کہ "سامراجی طاقتیں افریقہ میں ترقی پسند حکومتوں کا تختہ اُلٹنے کی پالیسی پر کاربند ہیں' یوگنڈا میں صدر ابوتے کی حکومت کا جو تختہ اُلٹا گیا ہے وہ اسی پالیسی کی کاربندگی کا نتیجہ ہے"۔ سنگاپور میں صدر ابوتے کے قیام کے دوران برطانوی استعماروں نے بعض فوجی اور شہری حکام کو ورغلایا کہ وہ جنرل امین کی سرکردگی میں صدر ابوتے کی حکومت کے خلاف بغاوت کر دیں"۔ 'ماتری بھومی' لکھتا ہے کہ "باغی حکومت کی طرف سے برطانیہ کو دوستانہ تعلقات کی پیشکش اس واقعہ کی کھلی نشاندہی کرتی ہے۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ صدر ابوتے کی قیادت میں یوگنڈا کے ترقی پسند عوام برطانوی استعماروں کی پٹھو حکومت کا تختہ اُلٹ دیں گے"۔

یوگوسلاویہ کے رسالہ "کمیونسٹ" کے مطابق اپنے چھ سالہ دورِ حکومت میں صدر ابوتے نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف افریقی عوام کی قومی آزادی کی جدوجہد کی مسلسل حمایت کی تھی۔ اور یوگنڈا میں قبائلی امتیاز کی مخالفت کی تھی۔ افریقی ممالک کے اتحاد کے لئے کوشاں تھے۔ صدر ابوتے کی انھیں ترقی پسندانہ رجحانات کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ کے حکومتی حلقے اور ان کے نقیب رسالے اور اخبارات آج اُن کی حکومت کا تختہ اُلٹے جانے پر خاصا اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں۔

الجزائر

الجزائر اور فرانس کی حکومت کے درمیان تیل کے مسئلہ پر ہونے والی گفتگو جو کہ پچھلے پانچ ماہ سے جاری تھی، ختم ہو چکی ہے کیونکہ حکومت



بومدین نے تیل کی صنعت کو قومیانے کا اعلان کر دیا

الجزائر نے فرانسیسی تیل کمپنیوں کو قومی تحویل میں لے لیا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ فرانس کو تیل کی فراہمی پر پابندی عائد کر دی ہے۔ الجزائر نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ وہ گیس اور تیل صاف کرنے کی صنعت کو بھی قومی ملکیت میں لے لے گا۔

صدر بومدین کی حکومت کے اس اقدام سے نہایت ہی دوررس نتائج برآمد ہونے والے ہیں۔

باقی صفحہ ۳۰ پر

ایک معمولی سرکاری افسر ملز کا مالک بن گیا

نمائندہ الفتح ملتان

اللہ وسایا ملز ملتان کے مزدوروں نے ایوب خاں کی آمریت کے آخری دور میں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے ایک زبردست جنگ لڑی تھی۔ مل مالک کے ہتھکنڈوں، اور نام نہاد مزدور رہناؤں کی سازشوں کے باوجود ان کی یہ جدوجہد ابھی تک جاری ہے۔ اس جدوجہد میں گذشتہ دنوں پھر شدت آئی ہے جبکہ مل کے مزدوروں نے ایک سازش کے تحت کامیاب کرائی جانے والی پاکٹ یونین پر قبضہ کرکے اسے سرمایہ داروں کے کاسہ لیسوں سے پاک کر دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اپنے دیرینہ مسائل حل کرانے کے لئے مطالبات کا چارٹر پیش کیا ہے۔ اللہ وسایا ملز ملتان کے مزدوروں کی جدوجہد اس کے بعد ایک نیا موڑ اختیار کر چکی ہے۔ لیکن موجودہ صورت حال کے جائزہ سے قبل ضروری ہے کہ اللہ وسایا مل کے مزدوروں کی پوری جدوجہد کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ تاکہ اس کے پس منظر میں موجودہ صورتحال بہتر طور پر سمجھی جا سکے۔

اللہ وسایا ملز کے مزدوروں کے مسائل کی اصل نوعیت یہ ہے کہ اس ملز کے مالکان جو چند سال پہلے تک انتہائی معمولی حیثیت کے مالک تھے یعنی کوئی کھڈی اور آڑھت میں چند پیسے کما رہا تھا، دوسرا منشی تھا۔ اور تیسرا حکومت کا ایک معمولی افسر تھا۔ رشوت، سفارش، ہیرا پھیری، سرکاری ٹیکسوں میں غبن، مزدوروں کے حقوق پر ڈاکہ زنی کر کے یہ سب لوگ چند سال کے عرصے میں اب کروڑ پتی بن گئے ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں اس مل میں لاکھوں روپے کے سرکاری ٹیکسوں کی چوری کا انکشاف کیا گیا تھا۔ اور سرکاری سطح پر تحقیقات بھی کروائی گئی تھی لیکن بعد میں نامعلوم وجوہ کے سبب معاملہ کو دبا دیا گیا۔

مالکان کے بڑھتے ہوئے مظالم سے تنگ آ کر مارچ ۱۹۶۹ء میں مزدوروں نے ملک گیر ہڑتال میں حصہ لیا۔ اور مزدور یونین کے نام سے اپنی نمائندہ تنظیم بھی قائم کر لی۔ ۱۹۶۵ء سے ورکرز یونین کے نام کی ایک رجسٹرڈ تنظیم موجود تھی لیکن اس کے عہدوں پر مالکان کے چہیتے غیر مزدور افراد مثلاً صدارت پر مختار احمد فورمین اور جنرل سیکرٹری کے عہدہ پر عزیز رضاء الحق فورمین قابض چلے آ رہے تھے۔ ہڑتال کے بعد مالکان کو ورکرز یونین کے پالتو افراد کے بجائے مزدور یونین کے بانی پانچ مزدور رہنماؤں سے سمجھوتہ پر دستخط کرنے پڑے۔ اور چند مطالبات تسلیم کرنے پڑے۔ اس موقع پر مزدوروں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر چند نام نہاد مزدور لیڈران نے جو اپنی غداری، مزدور دشمنی اور اسلام پسندی کے لئے مشہور ہیں۔ مزدوروں کے ساتھ دھوکا کیا اور انہیں وہ شرائط سنائیں جو انگریزی میں لکھے گئے معاہدہ میں سرے سے موجود ہی نہیں تھیں۔ لیکن لیکن مزدور نمائندوں کو اس ملی بھگت کا علم اس وقت ہوا جب مالکان اپنے وعدوں سے منحرف ہو گئے۔ اور تحریری معاہدہ کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ یہ مارشل لا کے نفاذ کے بعد کا دور تھا۔

صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چین پلٹ سوشلسٹ اسلام پسند مل مالک میاں مقبول نے یونین کے سرگرم کارکنوں، عہدیداروں اور مزدوروں کے خلاف برطرفی، تالہ بندی، چھانٹی، معطلی، جھوٹے مقدمات اور تشدد کے ہتھیار آزمانے شروع کر دیئے۔ قانون کا احترام کرتے ہوئے انتہائی پرامن اور قانونی انداز میں مصروف جدوجہد رہے۔ لیکن فتح قانون شکن مالکان کی ہوتی رہی۔

نومبر ۱۹۶۹ء میں ظلم و تشدد کا سلسلہ عروج پر پہنچ گیا۔ مزدور یونین کے اہم عہدے داروں سمیت بہت سے کارکنوں کی غیر قانونی تالہ بندی کر دی گئی۔ جس کے جواب میں مزدوروں نے صنعتی تعلقات کے تازہ نفاذ شدہ قانون کی دفعہ ۴۶ کی ذیلی دفعہ ۲ کے تحت اپنا قانونی حق استعمال کرتے ہوئے انتہائی پرامن اور مکمل ہڑتال کر دی۔ مذکورہ دفعہ میں لکھا ہے کہ "غیر قانونی ہڑتال کے نتیجے میں کی گئی تالہ بندی اور غیر قانونی تالہ بندی کے جواب میں کی گئی ہڑتال کو غیر قانونی نہیں سمجھا جائے گا۔"

ہڑتال رات کی شفٹ میں ہوئی تھی۔ صبح پولیس افسران کے نمائندہ یعنی تھانہ ممتاز آباد کے ایس ایچ او صاحب تشریف لائے۔ اور مطالبات

سیکرٹری محکمہ محنت کے پاس فائل ڈھائی ماہ میں بھی نہ پہنچ سکی

کی فہرست طلب کی۔ وہ فہرست انہیں فراہم کی گئی۔ جس میں تالہ بندی کے خاتمہ، برطرف شدگان کی بحالی اور اجرتوں میں اضافہ وغیرہ کے مطالبات کے علاوہ ورکرس یونین رجسٹرڈ کے انتخابات کروانے کا مطالبہ بھی تھا۔ کیونکہ اس یونین کا چندہ مزدوروں کی تنخواہ سے جبراً کاٹ لیا جاتا تھا۔ لیکن انتخابات کروائے بغیر یونین پر مالکان کے حواری قابض تھے۔ جو صنعتی آرڈیننس مجریہ ۱۹۶۹ء کی دفعہ ۲ کی ذیلی دفعہ ۲۸ (iii x x) کے تحت مزدور کی تعریف میں نہیں آتے۔ ہڑتالی مزدوروں نے یہ سوچ کر اس بار پھر معاہدہ کے وقت وہ انتہائی سادگی سے مات نہ کھا جائیں۔ اپنی رہنمائی اور امداد کے لئے مزدور رہنماؤں، جناب اشفاق احمد خان ایڈوکیٹ، جناب محمود نواز خان بابر ایڈوکیٹ اور قومی مزدور محاذ ملتان کے کنوینر سید اشرف حسین رضوی کو بھی اپنے ساتھ شامل کیا۔ ان حضرات کی آمد سے پہلے مجسٹریٹ سید حمید احمد شاہ صاحب اور ان کے پیچھے پیچھے پولیس کے ایڈیشنل ایس پی۔ محکمہ محنت ملتان کے سربراہ مسٹر نذر احمد تالپور۔ تھانیدار ممتاز آباد۔ مل مالکان میاں مقبول اور حاجی احمد حسن اور کئی وردی پوش اور سادہ لباس والے پولیس ملازمین بھی اندر آ چکے تھے۔

مزدور رہنماؤں کی آمد پر مذاکرات شروع ہو گئے۔ محکمہ محنت کے سربراہ نے ہڑتال کی قانونی حیثیت کو چیلنج کیا۔ اس پر انہیں صنعتی تعلقات کے قانون کی دفعہ (۲)، ۴۶ کا حوالہ دے کر خاموش کر دیا گیا۔ پھر طے ہوا کہ تالہ بندی کے شکار مزدوروں کو فوراً بحال کرنے کے بعد ہی جلد سے جلد ورکرس یونین رجسٹرڈ کے انتخابات کروائے جائیں اور اس کے بعد دوسرے مطالبات پر گفتگو ہوگی۔ بظاہر تصفیہ ہو ہی جاتا تھا۔ جس پر عمل درآمد کی ضمانت مجسٹریٹ صاحب تحریری طور پر دینے کے لئے تیار تھے۔ کہ اچانک سینکڑوں مسلح پولیس والے مل کی دیواریں پھلانگ کر اور زبردستی گیٹ کھول کر اندر گھس آئے اور تمام مزدوروں کو جن کی تعداد چار سو کے قریب تھی۔ زیرِ حراست قرار دے دیا۔ یہ کارروائی پلک جھپکتے میں ہوگئی۔ اس کے بعد مذکورہ رہنماؤں سمیت ۵۹ افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ جن میں سے مذکورہ تینوں مزدور رہنماؤں کے علاوہ باقی سب اللہ وسایا مل کے مزدور تھے۔ لیکن ہفت روزہ "زندگی" لاہور نے اپنی یکم دسمبر ۱۹۶۹ء کی اشاعت میں انہیں باہر سے آئے ہوئے بھنڈ مزدور لکھا۔

گرفتار شدگان میں سے مذکورہ بالا تینوں دوستوں

حکومت مالکان کے خلاف
سینکڑوں مزدوروں
کو بے روزگار کرنے کے
الزام میں فوجداری اور مارشل
لاء کے تحت کارروائی
کیوں نہیں کرتی؟

کے علاوہ پولیس اور عدالتوں نے بھی کسی کو باہر کا آدمی نہیں قرار دیا۔ گرفتاریوں کے بعد ۴۲ مزدوروں پر فوجداری مقدمات قائم کئے گئے۔ لیکن عدالت نے انہیں چند پیشیوں کے بعد بری کر دیا۔ گیارہ مزدور کارکنوں کو فوجی عدالت نے ایک ماہ سے ایک سال تک کی قید با مشقت کا مژدہ سنایا۔ ۲۳ نومبر کی گرفتاریوں کے بعد مزدوروں کی ہڑتال کافی عرصہ جاری رہی۔ چنانچہ بار بار گرفتاریاں ہوئیں۔ چند مزدوروں پر آج تک ایک مقدمہ چل رہا ہے۔ مارشل لاء ضابطہ ۱۶ اے کے تحت سزا یافتگان میں سے آٹھ نے پوری سزا کاٹی۔ باقی چار یعنی محمد ابراہیم، مسٹر اشفاق احمد خان، جناب محمود بابر اور مسٹر اشرف رضوی سزا پوری ہونے سے کچھ دن قبل جولائی ۱۹۷۰ء میں رہا کر دیئے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کے اسلام پسند ایس پی صاحب کے خلاف پچیس ہزار روپیہ مالکان سے وصول کرنے کا الزام ثابت از بام ہو چکا تھا۔ جسے ایس پی صاحب نے مسجد کے لئے چندہ قرار دیا۔ تھانیدار صاحب بھی پنج ہزاری ہوتے۔ "زندگی" کے مالکان کو دعوت دی گئی کہ ملتان سے اپنا اخبار نکالیں جس کے لئے مفت ہی سرمایہ داروں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ تو ماہ بعد یہ ناپاک "جسارت" اپنے ملازمین کی تنخواہیں بھی ہضم کر کے خاک ہوگئی۔

مل مالکان، سرکاری حکام، اسلام پسندوں اور نام نہاد سوشلسٹوں کے مقدس اتحاد کے نتیجے میں ہڑتال ایک ماہ سے زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔ تین سو مزدوروں کی غیر قانونی تالہ بندی کر دی گئی۔ مزدوروں کی جانب سے سینکڑوں کی تعداد میں عرضداشتیں محکمہ محنت سول حکام اور دیگر دفاتر میں پیش کی گئیں۔ لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں صوبائی لیبر سیکرٹری میاں محمود کے دورۂ ملتان کے موقعہ پر غیر قانونی تالہ بندی کے شکار مزدوروں کا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے بکمال مہربانی "تحقیقات" کی لیکن اسے خفیہ رکھا گیا۔ بلکہ تحقیقات کے دوران ثابت ہوگیا کہ تقریباً ننانوے فی صد مزدوروں کو صفائی پیش کرنے کا موقعہ دیئے بغیر ملازمت سے نکال دیا گیا تھا۔ اور جن کے خلاف انکوائری کرنے کا دعویٰ بھی کیا گیا۔ وہ اس سے انکاری ہیں۔ نام نہاد انکوائری کے کاغذات پر ان کے دستخط موجود نہیں ہیں۔ مقامی محکمۂ محنت کے سربراہ نے زبانی طور پر بتایا کہ تحقیقات کی رپورٹ مزدوروں کے موقف کی تائید کرتی ہے۔ اور انہوں نے لیبر سیکرٹری صاحب کے احکامات کے لئے لاہور خط لکھا ہوا ہے۔ اس دوران مل مالکان نے مقامی محکمۂ محنت کے نام ایک خط میں دعویٰ کیا کہ سیکرٹری صاحب نے انہیں بتایا ہے کہ معاملہ کو دبا دیا

صنعتی عدالت نے ملتان نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے

جائے گا۔ اس کے بعد کئی ماہ تک خاموشی رہی۔ سیکرٹری صاحب سے کئی بار ملنے کی کوشش کی گئی لیکن پتا چلا کہ اندرون ملک یا بیرون ملک مزدوروں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں دورہ پر ہیں۔ آخر کار ڈھائی ماہ بعد حضور والا سے ملاقات ہو سکی۔ انہوں نے کہا کہ فائل ابھی تک میرے سامنے پیش نہیں ہو سکی ہے۔ میں ان سے جواب طلب کر رہا ہوں۔ جب انہیں مالکان کے اس خط کے بارے میں بتایا گیا۔ جس میں مالکان نے لکھا تھا کہ سیکرٹری صاحب نے معاملہ کو دبا دینے کا وعدہ کیا ہے۔ تو انہوں نے اس کی تردید کی۔ ان سے کہا گیا کہ اگر یہ الزام غلط ہے تو مالکان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کیوں نہیں کرتے ؟ اس پر وہ مسکرا کر رہ گئے۔

بہر صورت ڈپٹی ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر ملتان نے اپنے مراسلہ نمبر ڈی۔ ڈی۔ ایل ڈبلیو/ ایم۔ آر (۱۶۴ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۷۱ء) کے ذریعہ مزدوروں کو یہ فرما کر ایل پی ڈبلیو کر دیا کہ صنعتی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔ کیونکہ اگر ہم نے مالکان کے خلاف قانون شکنی کا چالان کیا بھی تو اس سے مزدوروں کو کیا ملے گا ؟ اس مراسلہ میں یہ مژدہ بھی سنایا گیا کہ عنقریب صنعتی عدالت ملتان تشریف لا کر مقدمات کی سماعت کرے گی۔ مزدور یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ جرم ثابت ہونے پر حکومت مالکان کے خلاف سینکڑوں مزدوروں کو بے روزگار کرنے کے الزام میں فوجداری اور مارشل لا کے تحت کارروائی کیوں نہیں کرتی ہے ؟ اور مزدوروں کو لیبر کورٹ کے گورکھ دھندوں میں کیوں الجھاتی ہے ؟ چند مزدوروں کے مقدمات لیبر کورٹ میں دائر بھی کئے گئے تھے۔ لیکن کئی ماہ گزر چکے ہیں ہنوز روز اول ہے۔ مزدوروں میں بار بار لاہور جانے کی سکت نہیں اور عدالت نے ملتان نہ آنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ حالانکہ اکتوبر سے اس کی آمد کا غلغلہ ہے اور محکمہ محنت کئی بار اس سلسلے میں تحریری اور اعلانات کے ذریعے خوش خبری بھی دے چکا ہے۔ اس کے علاوہ انفرادی مقدمات میں بحالی کے سلسلے میں لیبر کورٹ کے اختیارات انتہائی محدود ہیں۔ اور پھر ۱۵ ماہ سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باعث یہ مقدمات اغلباً ٹائم بارڈ بھی ہو چکے ہیں۔

محکمۂ محنت نے مارچ ۱۹۶۹ء میں تینتالی مزدور یونین کا رجسٹریشن ہی نہیں کیا۔ اور مزدور رہنماؤں کی نظر بندی کے دوران ورکرس یونین کے علاوہ ایک پاکٹ یونین بنا کر محکمۂ محنت کی ملی بھگت سے ریفرینڈم کی گورا کشتی کروا ڈالی۔ یہ مشورہ "امروز" کے ایک سوشلزم پسند خضر صورت صحافی اور ایک مشہور بزرگ مزدور رہنما نے مالکان کو دیا تھا۔ چنانچہ ورکرس یونین نے ۱۹۷۰ء کے وسط میں دو سال کے لئے مزدوروں کی واحد نمائندہ تنظیم قرار دی گئی۔ چنانچہ اس صورت حال میں تالہ بندی کے شکار تین سو مزدور بے روزگاری، مفلسی اور تنگ دستی سے دوچار ہیں ان کے بال بچوں کا بھی یہی حال ہے۔ مل میں کام کرنے والے مزدوروں پر بھی جبر و ستم کا سلسلہ زوروں پر ہے۔

۸ جنوری ۱۹۷۱ء کو مل کے اندر کام کرنے والے ساٹھ مزدوروں نے جنہیں جبراً ورکرس یونین کا ممبر بنایا گیا تھا۔ مقامی محکمہ محنت کے سربراہ رجسٹرار آف ٹریڈ یونینز کے نام اپنے دستخطوں سے ایک درخواست دی اور انکشاف کیا کہ ورکرس یونین کے قیام کے بعد سے چھ سال کے دوران کبھی یونین کا عام اجلاس نہیں بلایا گیا۔ نہ کبھی انتخابات کروائے گئے۔ رسید کے بغیر ہر ماہ جبری طور پر تنخواہوں سے چندہ کاٹ کر ہضم کر لیا جاتا ہے۔ جس کا کوئی حساب کتاب نہیں دیا جاتا۔ علاوہ ازیں یونین کے صدر اور جنرل سیکرٹری فورمین ہونے کے باعث یونین کی بنیادی رکنیت کے بھی اہل نہیں ہیں۔ اس لئے محکمہ اپنی نگرانی میں یونین کے انتخابات کروائے۔ ۱۴ جنوری ۱۹۷۱ء کو یونین کے نام خط روانہ کیا گیا۔ جس میں صدر اور جنرل سیکرٹری سے یونین سے مستعفی ہونے، حساب کتاب پیش کرنے یونین کا عام اجلاس بلوا کر غیر جمہوری آئین کی جگہ نیا دستور منظور کروانے اور عام انتخابات کروانے کا مطالبہ کیا گیا۔ واضح ہو کہ یونین کا آئین قانون سے متصادم اور انتہائی غیر جمہوری تھا۔ جس میں عام ممبران کے حقوق کلی طور پر سلب کر لئے گئے تھے۔ اس سلسلے میں بار بار محکمۂ محنت سے رجوع کیا گیا جو طرح طرح کی طفل تسلیاں دیتا رہا۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء کو مزدوروں نے دوبارہ نام نہاد عہدے داروں کو بتیس تاریخ تک الیکشن کروانے کا نوٹس دیا۔ لیکن مالکان کے پٹھو عہدیداروں نے دونوں نوٹسوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی محکمہ محنت نے کچھ کیا۔ حالانکہ اس یونین کے دستور کے تحت دسمبر ۱۹۷۰ء میں عہدیداروں کی میعاد ختم ہو چکی تھی۔ اس صورت حال میں مزدوروں نے ورکرس یونین کی ایک مجلس عمل قائم کر کے ۳ فروری ۱۹۷۱ء کو مل کے گیٹ کے سامنے انتخابات کروانے اور فہرست مطالبات کی منظوری کے لئے ہینڈ بل کے ذریعے تمام اجلاس کا اعلان کیا۔ اور ایجنڈے میں نئے دستور کی منظوری اور سابقہ عہدیداروں سے ان کی مزدور دشمنی اور حساب کتاب میں غبن کے سلسلے میں جواب طلبی کے نکات بھی شامل کئے گئے۔

یکم فروری کو مقامی محکمۂ محنت کے سربراہ کو جو مل مالک مقبول اے شیخ کے حرف بحرف ہمنام

مِل مالکان کے غنڈے

آزادی سے گھوم

پھر رہے ہیں

اور پولیس اُن پر

ہاتھ ڈالنے کی زحمت

نہیں کر رہی ہے

مل مالکان محمود نواز بابر اور اشفاق احمد کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں

ہیں۔ ۳ فروری کے عام اجلاس کی تحریری اطلاع دی گئی۔ اور ان سے اپنا نمائندہ بھیجنے کی درخواست کی گئی۔ اسی سلسلے میں مزدوروں کے مشیر قانونی اور قومی مزدور محاذ ملتان کے کنوینر نے یکم فروری ۱۹۷۱ء کو بوقت ایک بجے دن مذکورہ افسر سے ملاقات کی۔ سرکار نے نہایت ترشروئی اور بے رخی کا مظاہرہ کیا اور مسٹر رضوی سے خواہ مخواہ جھگڑا کرنے کی کوشش کی۔ کراچی شپ یارڈ کے مزدور انہیں اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ جہاں انہوں نے تاریخی کارنامے انجام دیئے تھے کہ وہاں آج بھی فتنہ و فساد برپا ہے۔ قومی مزدور محاذ کے دفتر پر جب دو گھنٹے کے بعد مسٹر رضوی واپس پہنچے تو ابراہیم، عبدالغفور اور دو تین دوسرے کارکنوں کو منتظر پایا۔ پتا چلا کہ دو بجے کے قریب جب وہ گیٹ کے قریب کھڑے پر بیٹھے تھے، اندر سے تیس چالیس مسلح افراد نے نام نہاد صدر یونین نثار احمد قوریش اور یعقوب شفٹ انچارج کی قیادت میں محمد ابراہیم پر قاتلانہ حملہ کر کے ان سے چندہ کے پچاس روپے چھین لئے اور بیدردی سے زدوکوب کیا۔ اور ان کے کندھوں، ناک، انگلیوں اور پیروں کو مضروب کر دیا۔ جناب محمود بابر اپنی کار میں اشفاق صاحب، مسٹر رضوی اور محمد ابراہیم کو ممتاز آباد تھانہ لے کر پہنچے۔ جہاں مل کے چند افسران اور مذکورہ غنڈے پہلے سے موجود تھے۔ اور ابراہیم، غفور وغیرہ کے خلاف جھوٹی رپورٹ لکھوا چکے تھے۔ پتہ چلا کہ مل کے اندر مزدوروں کے دو گروہوں میں کسی ذاتی جھگڑے میں چند آدمی زخمی ہو گئے تھے۔ جس کا ذمہ دار ابراہیم اور غفور کو ٹھیرایا گیا۔ پولیس نے فریقین کے بیانات پر اکتفا کیا۔ حالانکہ اسے جائے وقوعہ پر جا کر دوکانداروں سے پوچھنا چاہیئے تھا۔ اس کے بعد محمد ابراہیم اور غفور نے تو گرفتاری سے بچنے کے لئے ضمانت قبل از گرفتاری کروالی۔ لیکن مالکان کے غنڈے ضمانت کروائے بغیر آزادی سے گھوم پھر رہے ہیں۔ پولیس نے ان پر ہاتھ ڈالنے کی زحمت نہیں کی۔

اس واقعے کے بارے میں اخبارات کو خبریں دی گئیں۔ نیشنل پریس ٹرسٹ سے وابستہ پی پی ایل کے اخبار "امروز ملتان" نے پہلے تو خبر چھاپی ہی نہیں۔ بعد میں چار تاریخ کو اس واقعہ پر انتہائی گمراہ کن خبر چھاپی جس میں مالکان کے موقف کی تائید کی گئی تھی۔ اندر کے صفحہ پر صحیح خبر چھاپی گئی جو غالباً غلطی سے لگ گئی تھی۔ اس کے بعد مقامی پیپلز پارٹی اور مزدور تنظیموں نے مزدوروں کی حمایت میں متعدد بیانات اشاعت کے لئے دیئے۔ لیکن امروز کے سوشلزم پسند صحافیوں نے کوئی خبر نہیں چھاپی۔ اس سے پہلے ۳۱ جنوری ۱۹۷۱ء کو پی پی ایل ورکرس یونین کے صدر اور ممتاز انقلابی دانشور جناب محمد صفدر میر نے جب ملتان کا دورہ کیا تو صفدر میر کی جدوجہد کے نتیجے میں اپنی ملازمتیں محفوظ پانے والے ان ہی میں سے چند سینیر صحافی حضرات نے نہ صرف یہ کہ حق نمک ادا کرتے ہوئے میر صاحب کے دورہ کا مکمل بائیکاٹ کیا۔ بلکہ یہ بھی ارشاد کیا "صفدر میر کب سے دانشور ہو گیا ہے؟"

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟

تین فروری ۱۹۷۱ء کو مل کے گیٹ پر مزدوروں نے اپنا جلسۂ عام منعقد کر کے یونین کا نیا دستور منظور کیا۔ اور سالانہ انتخابات کروائے۔ جلسہ کی صدارت سید اقبال حسین ڈبل سائیڈر نے کی۔ تینوں شفٹوں کے مزدوروں نے جلسہ میں شرکت کی۔ تیرہ عہدے داروں میں سے گیارہ کارخانے کے اندر کام کرنے والے مزدوروں میں سے اور دو غیر قانونی تالہ بندی کے نشانہ اور قید و بند کی منزلوں سے سرخرو کارکنوں میں سے چنے گئے۔ یعنی جنرل سیکرٹری عبدالغفور صاحب اور خازن جناب محمد ابراہیم کو چنا گیا۔ جلسہ سے پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں جناب اشفاق احمد خان اور مسٹر محمود بابر قومی مزدور محاذ کے جناب اشرف رضوی اور روڈ ٹرانسپورٹ ورکرس یونین کے صدر ملک باقی احمد نے بھی خطاب کیا۔ اور اللہ وسایا کے مزدوروں کو اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ ایک بجے سے تین بجے تک جلسہ عام جاری رہا۔ اور پورے عرصے میں مزدور اتحاد زندہ باد اور اسی قسم کے دوسرے نعروں سے جلسہ گاہ گونجتی رہی۔ مل کے اندر بیٹھا ہوا مالک مقبول اسے شیخ نعروں کی آواز سن سن کر کانپتا رہا۔ جلسہ گاہ کے قریب پولیس کے دو ٹرک مسلح سپاہیوں سے بھرے ہوئے موجود تھے۔ جو بار بار مزدوروں کو دہشت زدہ کرنے کے لئے جلسہ گاہ کے سامنے سے گزرتے تھے۔ بہت باوردی اور سادہ پوش پولیس والے بھی موجود تھے۔ "امروز ملتان" نے اپنی شاندار روایات برقرار رکھتے ہوئے اس جلسۂ عام کی خبروں کا بھی مکمل بائیکاٹ کیا۔ جلسے کے خاتمے پر یونین کے نو منتخب صدر سید اقبال شاہ جب مل کے اندر گئے تو مزدوروں نے کام روک کر نعروں سے ان کا استقبال کیا۔

یونین کے نئے عہدیداروں نے انتخابات کی اطلاع مالکان، محکمۂ محنت ملتان، صوبائی محکمۂ محنت لاہور، سول انتظامیہ اور سابقہ عہدے داروں کو دے دی ہے اور مالکان کو مزدوروں کے گیارہ مطالبات بھی پیش کر دیئے ہیں۔ جن میں برطرف شدگان کی بحالی، ۱۵ دن کے غصب شدہ بونس کی ادائیگی، اجرتوں میں اضافہ، فیئر پرائس شاپ پر سستے راشن کی فراہمی۔ نوے حاضریوں کے بعد ہر مزدور کی مستقلی وغیرہ شامل ہیں۔ باہمی مذاکرات کے ذریعے مسائل طے نہ کرنے پر یونین ہڑتالی نوٹس دینے پر مجبور ہوگی۔ ابھی تک مالکان، محکمۂ محنت اور دیگر تمام لوگ چپ سادھے ہوئے ہیں۔ لیکن مالکان اور ان کے نمک خوار صحافی، مزدور لیڈر اور دوسرے پالتو افراد اپنا پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ کسی صورت سے پیپلز پارٹی کے رہنماؤں محمود بابر، اشفاق احمد، قومی مزدور محاذ کے کارکنوں اور دیگر مزدور دوست تنظیموں کے رہنماؤں کے خلاف جھوٹے مقدمات بنوائے جا سکیں۔

اللہ وسایا کے مزدور تمام باتوں سے بے پروا

باقی صفحہ ۳۰ پر

"کسی دوسرے کو ہلاک کرنا خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے"

'نکسن کو سُولی پر چڑھا دو!'

وہاب صدیقی

"تُم لوگوں نے ایک طرف تو صدر نکسن کو ووٹ دیا جو ہر اس نوجوان لڑکے کا قاتل ہے جسے ویت نام میں زبردستی جنگ کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ دُوسری طرف ہمارے خلاف سزائیں سناتے ہو۔"

اس کی آواز کمرۂ عدالت میں گونج رہی تھی وہ پرجوش اور جنونی انداز میں امریکی سامراج کے بڑھتے ہُوئے اندرونی اور بیرونی تضادات کو عیاں کر رہی تھی، سات مردوں اور پانچ خاتون ججوں پر مشتمل جیوری کو امریکی معاشرہ کے رستے ہُوئے ناسُور دکھا رہی تھی۔ وہ انسانیت کے رکھوالوں "امن" اور سلامتی" کے علمبرداروں اور جمہوریت "کا دم بھرنے والوں کے مکروہ اور بھیانک چہروں سے نقاب نوچ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے کرب جھلک رہا تھا۔ یہ اداکارہ شیرون ٹیٹ کے قتل میں ماخوذ ۲۲ سالہ خوبرو ملزمہ پیٹریشیا کرینونکل تھی۔ جیوری بڑے غور سے اس کا بیان سُن رہی تھی۔ عدالت میں موجود بعض افراد سے حیرانی سے تک رہے تھے۔ کچھ کے سر احساسِ ندامت اور شرمندگی سے جھکے ہُوئے تھے اور کچھ کی آنکھوں میں حسرت تھی۔

بیان کے دوران وکیل صفائی نے مداخلت کی اور ملزمہ کو بچانے کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس پر ایل ایس ڈی کے نشہ کا اثر ہے لیکن پیٹریشیا کرینونکل جس کا ضمیر زندہ تھا اور جو امریکی معاشرہ کی ستائی ہوئی تھی، وکیل کی باتوں کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور جنونی انداز میں چلائی کہ "میں نے جو کچھ کیا ہے اس کا نتیجہ بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو اُسی وقت ہلاک کر لیا تھا جب میں نے اداکارہ شیرون ٹیٹ کی مہمان گیل فولگر کو چاقو مار کر ہلاک کیا تھا۔ کسی دُوسرے کو ہلاک کرنا خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ہم سب ایک دُوسرے سے پیوستہ ہیں۔ ہم اکٹھے رہتے ہیں۔ ہم ایک دُوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ میں سزا پانے کے لئے تیار ہُوں لیکن ہمیں سزا سنانے سے پہلے لاکھوں انسانوں کے قاتل نکسن کو تختۂ دار پر لٹکاؤ۔"

مس پیٹریشیا نیونکل نے اقبالِ جرم کرتے ہُوئے بتایا کہ "میں نے گیل فولگر کا تعاقب کر کے اُس پر چاقو سے حملہ کیا پھر مسٹر لا بیانکا کے شوہر لینو کی چھاتی پر بھی چاقو کے متعدد وار کئے اور مقتول کے پیٹ سے بہنے والے خون کو پونچھ کر دیوار پہ نشانات بنا دیئے۔"

شیرون ٹیٹ کے قتل کی دوسری ملزمہ ۲۱ سالہ لیزلی وان ہوٹن نے عدالت کو بتایا کہ اسکول کے زمانے میں ایک عشق میں ناکامی کے بعد اس نے سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۱۵ سال تھی۔ پھر اُس نے نشہ آور اشیاء کا استعمال شروع کر دیا۔ اور پھر چارلیس مینس کے خاندان میں شامل ہو گئی۔

مس لیزلی وان ہوٹن کا بیان اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ امریکی معاشرہ تباہی کے دہانہ پر پہنچ گیا ہے امریکی اجارہ دار سرمایہ داروں اور حکمران طبقے نے پوری قوم کو ایسی مشین بنانے کی کوشش کی ہے جس کا مقصد دولت کے سوا اور کچھ نہیں۔ چند سکوں کے حصول کے لئے جہاں گلی گلی، کوچے کوچے جسم و جان کی تجارت ہونے لگی ہے۔ وہاں راتوں رات امیر بننے کی خواہش نے جرم کو بھی تجارت بنا دیا ہے۔ چند ڈالر دے کر آپ اپنے دُشمن کو اغوا۔ یا قتل کروا سکتے ہیں۔ اس وقت جرائم کی تجارت امریکہ کا سب سے بڑا منافع بخش کاروبار ہے۔ امریکی محکمہ انصاف کے مطابق جرائم کی تنظیموں کی سالانہ آمدنی چار سو کھرب ڈالر ہے۔ جب ۱۹۶۸ء میں ویت نام کے جنگی اخراجات کے لئے حکومت نے دس فیصد سپر چارج ٹیکس لگایا تو ماہرینِ معاشیات کا کہنا تھا کہ اگر جرائم کی آمدنی حکومت کو مل جائے تو اسے محصولات کی شرح میں دس فیصد کمی کرنی ہو گی۔ لیکن جرائم کی روک تھام ناممکن ہے کیونکہ اس کاروبار کے مالک نہ صرف حکام کا مُنہ سکوں سے بھر دیتے ہیں بلکہ وہ امریکہ کے اجارہ دار سرمایہ داروں کی فہرست میں شمار ہونے کی وجہ سے حکمران طبقے کو اپنی آہنی گرفت میں لئے ہُوئے ہیں۔

استحصالی نظام کی پیدا کردہ ذہنیت نے نئی نسل کو جنسی بے راہ روی کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ پندرہ پندرہ سال کے بچے عشق اور محبت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ زیادہ تر کو ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑتا ہے۔ احساسِ ناکامی کو کم کرنے کے لئے وہ نشہ آور اشیاء کا سہارا لیتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ سماج دُشمن عناصر سے جا ملتے ہیں۔

لیکن ۲۲ سالہ پیٹریشیا کرینونکل کا بیان اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ نوجوان نسل اپنے حقیقی مجرموں سے واقف ہو گئی ہے۔ وہ جان چکی ہے کہ امریکی سرمایہ دار اور حکمران طبقہ نہ صرف امریکی عوام بلکہ تمام دُنیا کے عوام کا دُشمن ہے۔ پیٹریشیا کرینونکل کا یہ بیان کہ "کسی دوسرے کو ہلاک کرنا خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے کے مترادف ہے" اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ امریکہ کی نئی نسل امریکی فرد کو برتر نہیں سمجھتی۔ وہ چاہتی ہے کہ جس طرح امریکہ کا قانون قاتل کو سزائے موت دیتا ہے۔ اسی طرح نکسن کو بھی سزائے موت دی جائے، جو ویت نام، کمبوڈیا اور لاؤس میں کھلی جارحیت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اور نہایت بے رحمی اور بے دردی سے شہری اور دیہی علاقوں پر بمباری کر رہا ہے۔ امریکی عوام اور طلبہ اپنے سامراجی حکمرانوں کے خلاف اُٹھ

کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے ملک گیر مظاہرے اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ امریکی عوام عملی طور پر اپنی جدوجہد کو سامراج دشمن تحریک کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ امریکہ کی یہ نوجوان نسل سامراجی ریاست کے تمام کل پرزوں سے نفرت کرتی ہے۔ ایک طالب علم نے اپنے انٹرویو میں امریکی عدالتوں کے بارے میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا: "ان عدالتوں کو میری بے گناہی یا جرم پر فیصلہ دینے کا کوئی حق نہیں۔ یہ عدالتیں سامراجی ریاست کا ایک حصہ ہیں۔ اس ریاست کا جو اندرون اور بیرونِ ملک عوام پر بے پناہ جبر و تشدد کر رہی ہے۔ یہ عدالتیں بذاتِ خود مجرم ہیں۔ اور میں مجرموں سے کبھی بھی رحم کی بھیک نہیں مانگ سکتا۔" یہی وجہ ہے کہ وہ عدالتوں میں بے خوفی سے بلا جھجک اقبال جرم کر لیتے ہیں۔

امریکی طلبہ کی ایک تنظیم ایس ڈی اور ایس مقولہ پر عمل پیرا ہے کہ "جو تشدد یا بندوق پر یقین نہیں رکھتا وہ انقلاب دشمن ہے"۔ یہ تنظیم اندرون ملک فوجی تنصیبات اور سرکاری دفاتر کو تباہ کر رہی ہے۔

امریکی عوام کی اس جدوجہد اور نظریات کے مدنظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ امریکی سامراج اپنے ہی ملک میں عالم نزاع میں ہے۔ اور امریکی عوام اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک رہے ہیں اور اب وہ دن دور نہیں جب چچا سام کے دیس سے ہی سامراجی نظام کا جنازہ نکل جائے گا۔

بقیہ: محنت کش

ورکروں میں اعتماد بحال کرنے، انہیں مربوط کرنے، اور طبقاتی تعلیم دینے کا بندوبست نہ کیا گیا تو مستقبل قریب میں پیش آمدہ کسی بھی سنگین مرحلے میں پیپلز پارٹی کا پنپنا دشوار ہو جائے گا۔ صوبائی قیادت کے لئے ضروری ہے کہ پیپلز پارٹی کی ناکامیوں کی تمام تر ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے کے بجائے خود تنقیدی کا استعمال بھی کرے اور اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ بھی لے۔ صوبائی قیادت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ دور دراز کے علاقوں میں جہاں پیپلز پارٹی مقبول ہونے کے باوجود ناکام ہوئی ہے۔ مقامی قیادت کے بارے میں معلومات جمع کرے۔ اور وہاں متبادل قیادت کا بندوبست کرے۔ قیادت اوپر سے ٹھونسنے کے بجائے مقامی طبقوں کے صلاح و مشورے سے منتخب کی جائے تاکہ عوام متحد ہو کر جدوجہد کر سکیں اس کے علاوہ قیادت کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کے مسائل میں دلچسپی لے اور ان مظلوموں کو محض سرمایہ داروں اور جاگیرداروں تک نہ چھوڑے۔ یہ ایک راستہ ہے جو پیپلز پارٹی کو آگے لے جا سکتا ہے۔

بقیہ: عالمی سیاست

مبصرین کا خیال ہے کہ برطانوی نوآبادیاتی راج کے باقی ماندہ آثار الجزائر کی سرزمین سے تقریباً مٹ جائیں گے اور الجزائریوں کی قومی آزادی و خودمختاری کو مزید تقویت ملے گی۔ اسے اور مشرق وسطیٰ کی سیاست میں کھل کر حصہ لینے کا موقع ملے گا۔

تیل کی صنعت کو قومی تحویل میں لے کر الجزائر نے دوسرے عرب ممالک کی رائے عامہ کو بھی متاثر کیا ہے۔ سعودی عرب میں تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لینے کی تحریک کو اس اقدام سے تقویت ملے گی۔ اور امریکی سامراج کے حاشیہ بردار شاہ فیصل کی حکومت کی چولیں ڈھیلی پڑ جائیں گی۔

بقیہ: سرحد میں پیپلز پارٹی

ہو کر بڑی مستقل مزاجی سے طبقاتی جدوجہد کر رہے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ سرمایہ داروں اور ان کے کاسہ لیسوں کی تمام سازشیں ناکامی کا منہ دیکھیں گی۔ اور فتح محنت کشوں کی ہوگی۔ لیکن وہ تنخواہوں میں اضافہ یا ملازمتوں کے تحفظ کو اپنی منزل نہیں سمجھتے بلکہ وہ ایسے روشن مستقبل کے لئے کوشاں ہیں۔ جب مزدور طبقہ کسانوں اور دوسرے تمام محبان وطن کو اپنے ساتھ ملا کر پاکستان سے لوٹ کھسوٹ پر مبنی نظام کا خاتمہ کر کے عوامی جمہوری انقلاب برپا کرے گا۔

کراچی سے ڈھاکہ ---۴



ہماری آپ کی لڑائی ایک ہے

محمود شام

آج مسٹر بھٹو کو ہیلی کاپٹر سے طوفان زدہ علاقوں کے دورے پر جانا ہے۔

میں اور الطاف رانا صبح سویرے شاہ باغ ہوٹل سے نکل آئے ہیں۔ وقت ساڑھے آٹھ ہے۔ بنگلہ دیش کے وقت کے مطابق ۱۱۳۴ انٹرکانٹی نینٹل کھلا ہے۔ زیڈ اے سلہری۔ زیڈ اے بھٹو کے حضور نہایت مؤدبانہ انداز میں بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ پچھلے دو تین روز سے تخلیے کی ملاقات کے لئے کوشش میں ہیں۔ آج صبح صبح وہ ادھر آنکلے ہیں لیکن بھٹو صاحب نے دروازہ کھلا رکھوا دیا ہے۔ ان سے جو بھی ملنے آ رہا ہے اسے اندر آنے دیا جا رہا ہے۔ پھر اتنے لوگ ہو جاتے ہیں کہ زیڈ اے سلہری اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔

۹-۴۵ پر ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل سے روانہ ہوتے ہیں۔ ڈھاکہ ائیرپورٹ کے ایک بار میں آرمی کا ہیلی کاپٹر موجود ہے۔ آرمی کے ایک افسر مسٹر بھٹو کو ہیلی کاپٹر کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ مسٹر معراج محمد خاں۔ مسٹر مصطفےٰ کھر، مخدوم زمان طالب المولیٰ، میجر جنرل اکبر خاں، ڈاکٹر مبشر حسن، نواب صادق حسین قریشی محمد حیات خاں شیرپاؤ ہیں۔

ہم سب نے پیٹیاں کس لی ہیں ۵۵-۹ بج رہے ہیں۔ ہیلی کاپٹر مشرقی پاکستان کے سبزہ زاروں سے گزرتا ہوا، ہوا کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اب زمین کہیں کہیں دکھائی دے رہی ہے۔ باقی پانی پھیلا ہوا ہے۔ گدلا گدلا پانی کہیں کہیں ایک آدھ مکان دکھائی دے رہا ہے یہ ایک دم ایک چمک سی آنکھوں کو چندھیا جاتی ہے۔ یہ وہ چند مکانات ہیں جو طوفان کی تباہیوں کے بعد تعمیر کئے گئے ہیں۔ ان کی ٹین کی نئی چھتیں سورج کی چمک کو واپس پھینکتی ہیں تو ہیلی کاپٹر میں بیٹھے لوگوں کی آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ پنجاب اور سندھ، بنگال کے طوفان زدہ علاقوں پر سے گزر رہے ہیں۔ ان کے چہروں پر گھمبیر اداسی، آنکھوں میں گہرائی ہے۔ یہاں کبھی لوگ بستے تھے، مسکراتے تھے، فصلیں لہلہاتی تھیں۔ اب پانی ہے۔ کیچڑ ہے اور زمین بوس مکانات ہیں۔ نومبر، دسمبر، جنوری۔ تین مہینے ہو چکے ہیں طوفان آئے۔ لیکن زمین پر طوفان کی تباہ کاریاں ابھی تک پڑھی جا سکتی ہیں۔ یہ بھرے پرے گاؤں کیا ہوئے۔ گلیوں میں کھیلتے بچے کیا ہوئے۔ یہ تین چار مکانات۔ بچھڑنے والے ہزاروں ہم وطنوں کی یاد دلاتے ہیں۔ کبھی یہاں بستیاں آباد تھیں۔ ہم پاکستان کی سالمیت اور محبت کے دعوے دار اپنے لاکھوں ہم وطنوں کی موت کا افسوس کرنے تین مہینے کے بعد پہنچ رہے ہیں۔ جواب نہیں ہماری محبت کا۔ ہیلی کاپٹر نیچے اتر رہا ہے۔ شہر کے لوگ اس طرف بھاگ رہے ہیں۔ خاردار تاروں کے احاطے میں ہیلی کاپٹر اتر گیا ہے۔ غریب مزدور کسان بھاگ رہے ہیں۔ ہیلی کاپٹر ان کے لئے روز کا معمول بن چکے ہیں۔ مگر یہ ہیلی کاپٹر امدادی سامان نہیں لایا ہے۔ مغربی پاکستان سے چند ہم وطنوں کو لایا ہے۔

۱۱ بج کر تیس منٹ ہوئے ہیں۔ یہ پٹوا کھالی ہے۔ مسٹر بھٹو ہجوم میں چلے گئے ہیں۔ لوگ شکایت کر رہے ہیں کہ انہیں امدادی سامان۔۔ صحیح طریقے سے نہیں مل رہا ہے۔ اور اگر راشننگ ختم دو عشرہ کی گئی تو بہت سے لوگ مر جائیں گے۔ بھٹو صاحب نے انہیں تسلی دی کہ ہم نے ہیلی کاپٹر سے دیکھا ہے۔ بہت زیادہ تباہی ہوئی ہے۔ میں واپسی پر گورنر سے بات کروں گا۔ اور آپ کی سب باتیں ان تک پہنچاؤں گا۔ پٹوا کھالی کے ڈپٹی کمشنر، ریلیف کمشنر اور آرمی کے انجینیر ریلیف سنٹر کی طرف لے کر چل رہے ہیں۔ اندر کچھ نقشے ہیں جو پٹوا کھالی میں امدادی کام کی تفصیلات بتلاتے ہیں۔ یہاں کچھ چائے کا انتظام کیا گیا ہے اور معراج محمد خاں اور الطاف رانا باہر عام آدمیوں سے بات کرنے کے لئے نکل آئے

تین چار آدمیوں کی کوشش سے مُلک سلامت نہیں رہ سکتا

ہیں۔ ایک صرف دھوتی میں ملبوس ادھیڑ عمر ہموطن کو ہم نے روکا۔ اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی آنکھوں میں تیرتی اداسیاں ہمارے سب سوالات کا جواب تھیں۔ اور وہ نہیں جانتا تھا ہمارا مختصر سا بنگالی الفاظ کا ذخیرہ جواب دے گیا۔

ایک اور طالب علم نظر آئے ان سے امداد وغیرہ کے بارے میں دریافت کیا تو وہاں بھی شکایتوں کا ایک دفتر تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ علاقے کے چیئرمین اپنے لوگوں کو زیادہ امداد دیتے ہیں۔ واپسی پر ہیلی کاپٹر پر جانے سے پہلے انھوں نے پھر لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"ہم نے کچھ دیکھا اور تھوڑی بہت واقفیت حاصل کی ہے۔ میں ڈھاکے میں جا کر گورنر صاحب سے بات کروں گا۔ یہ بہت بڑی مصیبت تھی تکلیف تھی۔ آپ نے بڑی ہمت اور بہادری سے مقابلہ کیا۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور ملک سلامت رہے آپ کی کوششوں اور دعا ہی سے یہ ملک سلامت رہ سکتا ہے۔ ساری قوم کوشش کرے تو ملک سلامت رہے گا۔ تین چار آدمیوں کی کوشش سے ملک سلامت نہیں رہ سکتا۔"

بارہ بجے کے قریب ہیلی کاپٹر ہمیں دانگا بلی لے گیا۔ یہاں تعمیر کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا دکھائی دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ اس علاقے کا سب سے زیادہ متاثر ہونے والا تھانہ ہے۔ یہاں کم از کم ۵۰ فیصد جیتے جاگتے "ہم وطن ہلاک ہو گئے" ملبے کے ڈھیر اس ہلاکت کی داستانیں سنا رہے ہیں۔ یہ بزرگ، یہ بچے یہ نوجوان اس طوفان کی منہ بولتی کہانیاں ہیں، جو انسانوں کو بہا کر لے گیا۔ جو اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ یہ ہمارے ہم وطن ہیں۔ مگر ہمارے دل ان کے ساتھ نہیں دھڑکتے تھے۔ ورنہ یہ طوفان شہروں اور قصبوں کو تو مٹا لیتا مگر دلوں کے رشتے نہیں مٹا سکتا تھا۔ مغربی پاکستان۔ مشرقی پاکستان میں گھرا کیچڑ، دلدل میں سے تنگ سی پگڈنڈی پر چل رہا ہے۔ ایک پختہ مکان سے مقابلے میں سخت جان واقع ہوا۔ اس کی دہلیز پہ کھڑے ہو کر مسٹر بھٹو نے اپنے ان بھائیوں سے خطاب کرنا شروع کر دیا ہے۔

"ہم نے اپنی آنکھوں سے اتنا زبردست نقصان دیکھا ہے جو ہمارے زمانے میں اب تک نہیں ہوا۔ نومبر میں ہی میرا ارادہ تھا کہ میں یہاں آؤں۔ لیکن اس وقت حکومت کی کوشش کے بغیر ہم آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ اتنی بڑی تباہی تھی کہ کسی سیاسی جماعت تو کیا ہماری حکومت کے بس میں بھی نہیں تھا کہ اس کی تلافی کر سکے۔ دوسری حکومتوں کو بھی اس سلسلے میں امداد کرنا پڑی۔ اب میں آیا ہوں مغربی پاکستان کے لوگوں کا محبت کا پیغام پہنچانے۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ جب آپ پر مصیبت ٹوٹی تھی تو اس وقت مغربی پاکستان کے عوام نے اسے محسوس نہیں کیا تھا انہوں نے اس مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھا تھا۔ انہیں بڑا دکھ تھا۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان کے لوگوں نے جو کچھ بس میں تھا، امداد کی۔ آپ کو مکانوں کی ضرورت ہے۔ کپڑے



'یہ بہت بڑی مصیبت تھی۔ آپ نے بڑی ہمت اور بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا'۔ بھٹو

کی ضرورت ہے۔ یہ تباہی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ میں گورنر سے آج شام بات کروں گا۔ ہم سے جو خدمت ہو سکے گی کریں گے۔ اور جب عوامی حکومتیں بنیں گی تو ہم اور بھی زیادہ کوشش کریں گے۔"

یہاں کے لوگوں سے رخصت ہو کر ہیلی کاپٹر ہمیں پور فیشون لے آیا۔ یہ بہت بڑا قصبہ نظر آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کو اترتا دیکھ کر لوگ اس طرف بھاگ رہے تھے۔ ہمیں ہیلی کاپٹر سے شہر خالی ہوتا نظر آ رہا تھا۔ گلیاں، سڑکیں، کوچے انسانوں کو لے کر دوڑ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کے اترنے تک ہزاروں افراد جمع ہو چکے تھے۔ ایک اسکول کی عمارت کے احاطے میں یہاں کے کچھ لیڈروں نے لوگوں کو بٹھا دیا۔ اور بھٹو صاحب نے تقریر شروع کی۔ یہ تقریر پہلی تقریروں کی طرح اردو میں تھی۔ پہلے کی طرح ڈپٹی کمشنر سوا کھالی اس کا بنگلہ میں ترجمہ کر رہے تھے۔ لیکن یہ تقریر ترجمے کے بغیر بھی لوگوں کو سمجھ آ رہی تھی۔ بھٹو صاحب نے کہا:

"ہم دو روز سے ڈھاکے میں بات چیت کر رہے ہیں۔ انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد ہماری یہ بات چیت مستقبل کے لئے ہے۔ لیکن میرے نزدیک زیادہ اہم بات آپ سے ملنا تھا۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا جو آپ پر ٹوٹا۔ اتنی مصیبتیں اور اتنی تکلیفیں۔ اب ہم نے جو دورہ کیا ہے وہ اگرچہ نہایت مختصر ہے۔ لیکن اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ بے حد نقصان ہوا ہے۔ فصلیں تباہ ہو گئی ہیں۔ اتنے لوگ مر گئے ہیں۔ اتنی بڑی مصیبت دنیا میں کہیں نہیں آئی۔ آپ نے جس بہادری سے حالات کا مقابلہ کیا ہے وہ تاریخ کا ایک انمٹ باب ہے۔ غریب لوگ ہی مصیبت کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ ۲۳ برس میں ہمارے ساتھ صرف ناانصافیاں ہی نہیں ہوئیں، انسانوں نے بھی استحصال کیا ہے۔ اگر نظام درست ہو تو دنیا کے تمام مطالبات پورے ہو سکتے ہیں۔ اور مسائل کا حل مل سکتا ہے۔



عوامی حکومتوں میں لاٹھی گولی نہیں چلے گی

میرے بھائیو! پاکستان میں جو غریب ہے دنیا میں کہیں اور ایسی غربت نہیں ہے۔ ہماری زمین اچھی ہے۔ لوگ محنت بھی کرتے ہیں۔ وسائل بھی ہیں۔ لوگ بہادر بھی ہیں۔ پھر بھی غربت کیوں ہے۔ اگر غریب مزدور کسان کے مطالبے پورے ہوں، بیج ملے، زمین ملے، حقوق بحال ہوں، تو کیوں ان کے بچے خوش نہیں ہو سکتے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے ۲۳ برس کا جائزہ لے کر اپنی توجہ خاص طور پر اس طرف دی کہ ملک سے استحصال ختم کیا جائے۔ موجودہ نظام تبدیل کر کے انصاف پسند اور سوشلزم کا نظام لائیں۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے عوام کو غریبوں کو کپڑے صحت تعلیم روٹی کا پروگرام دیا۔ اس لئے مغربی پاکستان کے بھائیوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیاب کیا۔ ہمارے ملک میں یہ پہلا الیکشن تھا۔ جہالت بھی موجود تھی۔ لیکن اس میں عوام کا قصور نہیں تھا۔ حکومت اور نظام کا قصور تھا۔ ہماری پارٹی کے خلاف بہت کوشش کی گئیں۔ پریس خلاف تھا۔ بڑے لوگ مخالف تھے۔ مسلمانوں کو عوام دشمنوں نے کافر کا خطاب دیا۔ کیونکہ ہم تو سچے مسلمان ہیں۔ ہم نے کہا کہ یہ کافر اور مسلمان کی جنگ نہیں تھی۔ مظلوم اور ظالم کی جنگ ہے۔ مغربی پاکستان کے جن لوگوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیاب کیا وہ بڑے لوگ نہیں تھے۔ کسانوں، غریبوں، محنت کشوں اور مزدوروں نے پاکستان پیپلز پارٹی کو کامیاب کیا۔ ہمارا ایک ہی پوائنٹ ہے، غربت کو ختم کرنا، ظلم کو ختم کرنا۔ انصاف کا قیام۔ ہماری کامیابی اگرچہ مغربی پاکستان میں ہوئی ہے۔ لیکن پاکستان ایک ہے۔ ملک ایک ہے۔ ہم نے آپ کی خدمت کرنی ہے۔ پرجوش خدمت۔ ہم یہاں بھی جان کی ایسی ہی بازی لگائیں گے جیسی وہاں لگائیں گے۔ جیسے آپ کو یہاں لوٹا گیا ہے، سرمایہ داروں نے خون چوسا ہے وہاں کے سرمایہ دار بھی غریبوں کا خون چوس رہے ہیں۔ ہمارا مقابلہ بھی انہی کے ساتھ ہے۔ ہماری اور آپ کی لڑائی ایک ہے۔ ہم مل کر کامیاب ہوں گے۔ جو ملک کے دشمن ہیں وہ ہم کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں وہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان تعاون نہ ہو۔ یہ کوشش وہ بڑے لوگ کر رہے ہیں جنہیں خطرہ ہے کہ عوامی حکومت آئے گی تو ان کی اجارہ داریاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ وہ

بھٹو نے مشرقی پاکستان میں کام کیا ہوتا تو حالات مختلف ہوتے



اس وقت ڈھاکے سے کراچی، کراچی سے ڈھاکہ کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ ہم پوری کوشش کرینگے کہ ان کے ارادے کامیاب نہ ہوں۔ جب تک عوام کی طاقت ہمارے ساتھ ہے ہم ان سب کا مقابلہ کر سکتے ہیں تمام طاقتوں کا متحد ہو کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ملک کی سلامتی میرے ہاتھ میں ہے نہ کسی اور کے ہاتھ میں۔ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ تیرہ کروڑ عوام کے ہاتھ میں ہے۔ آپ دنیا کی باتیں سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو قابلیت دی ہے، عقل دی ہے۔ غریبوں کو جو آنکھیں اور کان دیتے ہیں، سرمایہ داروں کو اللہ تعالیٰ نے وہ آنکھیں اور کان نہیں دیئے۔ ہمیں عوام پہ اعتماد ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں گے ہمیں قبول ہوگا۔ ہمیں آپ کی امنگوں اور آزادی کا پورا خیال ہے۔"

ایوب خاں نے پاکستان کے غریبوں پر بڑا ظلم کیا تھا۔ ایوب خان کے خلاف جدوجہد کس نے شروع کی۔ کب آغاز کیا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ عوام کو جو تکلیف پہنچائے گا وہ ہمارا سب سے بڑا دشمن ہوگا۔ ہم پاکستان کو ایک رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک رکھیں گے۔ آپ اگر ایک پاکستان چاہتے ہیں تو ہاتھ اٹھا کر جواب دیں۔ (سب نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا "ایک پاکستان") ہاں غریبوں کا پاکستان ایک رہا ہے۔ ایک رہے گا۔ امیروں والا نہیں۔ بھٹو صاحب کی تقریر تالیوں کی گونج میں ختم ہوئی۔ اور انہوں نے "جیئے بنگلہ" کا نعرہ لگا کر رخصت چاہی۔

وہاں سے نکل کر قریب کے ایک اسکول میں گئے۔ اِدھر اُدھر لوگوں سے ملے، شکایات سنیں۔ یہاں سب لوگ مجسم شکایت بنے ہوئے تھے روٹی کپڑے اور مکان کا مسئلہ تھا۔ کسی کو دستور یاد تھا نہ چھ نکات کسی نے چھ نکات کا نام تک نہیں لیا۔ واپسی پہ ہیلی کاپٹر پر سوار ہو کر رخصت ہونے لگے۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ نے پولیس سے کہا کہ لوگوں کو ذرا دور ہٹا دیں۔ کہیں کوئی ہیلی کاپٹر کے پنکھے کی زد میں نہ آجائے۔ پولیس نے اپنی روایتی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے لوگوں کو ہٹاتے ہٹاتے ایک شخص کے لاٹھی مار دی۔ اس پر مجمع بپھر گیا۔ اور قریب تھا کہ اس سپاہی کی وردی وغیرہ اتار دی جاتی معراج محمد خاں بیچ میں جا پہنچے اور سپاہیوں کو دھکا دیکر ایک طرف ہٹا دیا۔ اور جس شخص کے لاٹھی لگی تھی اسے گلے لگایا۔ بھٹو صاحب ہیلی کاپٹر سے بولے "معراج! اسے یہاں لاؤ۔" انہوں نے اس شخص کو گلے لگایا۔ تسلی دی اور پھر ادھر وہیں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "یہ جو واقعہ ہوا ہے اس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔ یہ زیادتی کی بات ہے۔ عوامی حکومتوں میں لاٹھی گولی نہیں چلے گی۔ میں عوام میں سے ہوں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم نے بھی لاٹھیوں اور گولیوں کا مقابلہ کیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں ہمارے زخم باقی ہیں۔ لیکن عوامی دور میں اب یہ ظلم اور تشدد نہیں ہوگا۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ جو اتفاقیہ یا غلطی سے حادثہ ہوا ہے میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ خدا حافظ۔"

اس تقریر نے لوگوں کے جذبات کا رخ پھیر دیا ہے۔ لوگ ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اور ہیلی کاپٹر اوپر اٹھ رہا ہے۔ اب ہم ڈھاکے جا رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ پاکستان کے غریب مزدور کسان طبقے سے تعلق رکھنے والے کہیں بھی ہوں ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔ اگر مسٹر بھٹو نے مشرقی پاکستان میں بھی کام کیا ہوتا تو آج کے سیاسی حالات کتنے مختلف ہوتے۔

ہیلی کوپٹر ڈھاکے اتر رہا ہے۔ ہماری نیلی ٹویوٹا کو ابراہیم لئے کھڑا ہے۔ اس نیلی ٹویوٹا نے ہمیں متحرک کر رکھا ہے۔ دو بج رہے ہیں۔ آج پانچ بجے دھان منڈی میں بات ہونا ہے۔ ہماری عدم موجودگی میں ماہرین کی بات ہوئی ہے۔ یہ بات چیت نہایت اہم ہے۔

۱۹۵۲ء کی لسانی تحریک کا پس منظر

آخری قسط

محبوب جمال زاہدی

عوامی تحریک اردو زبان کے خلاف نہیں تھی

خواجہ ناظم الدین نے مشرقی پاکستان میں لسانی مسئلے پر پیدا شدہ بحران سے نجات حاصل کرنے کے لئے قائداعظم کو مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس مقبول عام تحریک کو دبانے کے لئے بابائے قوم کی شخصیت اور مقبولیت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ قائداعظمؒ پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے پہلی مرتبہ مشرقی بنگال کے دورے پر ۱۹ مارچ کو ڈھاکہ پہنچے۔ ۲۱ مارچ کو ڈھاکہ ریس کورس گراؤنڈ میں شہریوں کے استقبالیہ میں خطبۂ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے جہاں اور بہت سے اعلانات کئے وہاں ایک اعلان یہ بھی کیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے اس مسئلہ پر ہونے والے احتجاج پر نکتہ چینی کی اور اسے مسلمانوں کے درمیان افتراق پیدا کرنے کی کوشش قرار دیا۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ وہ سیاسی تخریب پسندوں یا ان کے ایجنٹوں کی ان کوششوں کو سختی سے کچل دیں۔ جو وہ اس صوبے کا امن تباہ کرنے کے لئے کر رہے ہیں۔

اس کے تین روز بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں خصوصی جلسۂ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یہی الفاظ دہرائے۔ گو کہ ریس کورس گراؤنڈ میں ان کی تقریر کے بعد بھی احتجاج کا سلسلہ چل نکلا تھا۔ لیکن جلسۂ تقسیم اسناد میں صورت حال اس سے مختلف ہوئی۔ قائداعظم نے جونہی یہ جملہ ادا کیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہی رہے گی تو جلسہ گاہ میں موجود طلبہ کا ایک گروہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے احتجاجاً "نہیں نہیں" کے نعرے بلند کئے۔ قائداعظم چند لمحوں تک خاموش رہے اور اس کے بعد انہوں نے اپنا خطبہ جاری رکھتے ہوئے کہا کہ لوگ انتشار پھیلانے کے لئے لسانی اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان کے یہ لازمی جزو ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو کر صرف اس صورت میں آگے بڑھ سکتے ہیں جبکہ پورے ملک کی قومی زبان ایک ہو۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اردو کو ہی ایک زبان کی حیثیت سے رائج اور نافذ کرنے کے خواہاں ہیں۔

قائداعظم کے اس دورے اور اس تبصرے سے خواجہ ناظم الدین کی ہمت بندھی اور وہ لسانی مسئلے پر قائم شدہ مجلس عمل سے کئے ہوئے معاہدے سے پھر گئے۔ لہٰذا ۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو صوبائی اسمبلی کا دوبارہ اجلاس ہوا۔ تو انہوں نے بنگالی کو صوبہ کی سرکاری زبان بنانے اور مشرقی بنگال کے تعلیمی اداروں میں اسے ذریعۂ تعلیم بنانے سے متعلق ایک قرارداد پیش کی۔ اور ایسا کرتے وقت اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا کہ اس سے قبل وہ مجلس عمل سے یہ معاہدہ کر چکے ہیں کہ صوبائی اسمبلی میں جو قرارداد منظور ہو گی اس میں مرکزی حکومت سے یہ سفارش کی جائے گی کہ بنگالی کو بھی ایک قومی زبان کا رتبہ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اجلاس میں انہوں نے اپنی قرارداد میں پیش کی جانے والی ترمیمات کی پوری قوت سے مخالفت کی۔

اس طرح بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دلانے کی تحریک کا پہلا مرحلہ ختم ہوا۔ اگر اس وقت اس تحریک کے اثرات پوری طرح تسلیم نہیں کئے گئے لیکن اس نے مشرقی بنگال کی سیاست کو ایک بالکل نیا رخ دیا۔ طلبہ برادری نے اپنے مسائل اور اس کے ساتھ ہی بالخصوص اپنے صوبے کے اور بالعموم پورے ملک کے مسائل کے بارے میں گہرا شعور اور ادراک حاصل کیا۔ وہ ان سازشوں سے بھی پوری طرح خبردار ہو گئے۔ جو حکمران طبقہ مشرقی بنگال کے استحصال کے لئے کر رہا تھا۔ اور ساتھ طلبہ کے ساتھ ہی عوام کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوا۔ سرکاری ملازمین کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوا۔ کیونکہ ان کی راہ میں حائل غربت اور مفلسی کے پردے روز بروز دبیز ہوتے جا رہے تھے۔ غذائی اجناس کی قلت۔ اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافے اور نوکر شاہی کی بالا دستی کے سانپ تیزی سے پھنکارے مارنے لگے تھے۔ عوام کے جائز حقوق سلب ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ سرکاری ملازموں اور پولیس تک کو ان کے حقوق سے محروم رکھا گیا تھا جس کے نتیجے میں وہ مظاہروں اور ہڑتالوں جیسے اقدام پر مجبور ہو گئے تھے۔

دوسری طرف حکومت جوابی اقدامات کے طور پر جبر و تشدد کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اخباروں پر پابندی تھی۔ کارکنوں اور رہنماؤں کو پس زنداں بھیج دیا گیا تھا۔ یا انہیں ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا گیا تھا۔ پارلیمنٹ کے اراکین اور وزرا کی خامیوں اور کمزوریوں

خواجہ ناظم الدین نے بابائے قوم کی شخصیت اور مقبولیت سے فائدہ اٹھایا

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوکر شاہی پہلے سے بہت زیادہ طاقت حاصل کر گئی تھی۔ سیاست میں اس نے باقاعدہ دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ اور اس نے حکمران پارٹی میں پھوٹ ڈال کر مختلف تنازعے پیدا کر دیئے تھے۔ ایک طرف حکمران پارٹی ایسے مقام سے روبہ زوال تھی دوسری طرف حزب اختلاف کی تحریکیں اور سیاسی جماعتیں ایک واضح شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔ ان حالات میں جون ۱۹۴۹ء میں مشرقی پاکستان عوامی لیگ قائم کی گئی۔ جس کے صدر مولانا بھاشانی، سیکرٹری شمس الحق اور جائنٹ سیکرٹری شیخ مجیب الرحمٰن اور خوندکر مشتاق احمد تھے۔

اسی اثناء میں بنگالی زبان کے ساتھ مزید زیادتیاں ہوئیں۔ ایک مشرقی پاکستانی مرکزی وزیر کے ایماء پر بنگالی رسم الخط تبدیل کر کے اس کی جگہ عربی کا رسم الخط متعارف کرانے کی کوشش کی گئی اس وقت مشرقی پاکستان کے تعلیمی سیکرٹری کے عہدے پر ایک غیر بنگالی سول سرونٹ مامور تھا۔ جس نے اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس سلسلے میں چٹاگانگ میں ایک کارندہ تلاش کیا گیا۔ جس نے حرف القرآن سوسائٹی کے نام پر بنگالی زبان کے رسم الخط کو عربی میں ڈھالنے کی تحریک شروع کی جو درحقیقت ایک آدمی کی تحریک تھی۔ اسے مرکزی حکومت کی جانب سے بڑی مقدار میں مالی امداد دی گئی۔ اس تحریک کے مقصد کے طور پر پاکستان کے عوام کی ثقافتی ہم آہنگی اور پاکستان کی تمام زبانوں کو ایک رسم الخط میں تبدیل کرنے کا نعرہ لگایا گیا۔ لیکن اس کا اصل مقصد بنگالی زبان و ادب اور ثقافت کی جڑوں پر حملہ کرنا تھا۔ اور اس طرح بالآخر بنگال کے عوام کو مکمل صوبائی خود مختاری کے جائز حق سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دینا تھا۔ اس مہم کی بنگال کے طلبہ اور دانشوروں نے سختی سے مذمت کی۔ اس پر کڑی نکتہ چینی کی۔ اور اس کے خلاف زبردست مظاہرے کئے۔ لہٰذا مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک لسانی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس کے چیئرمین مولانا اکرم تھے جبکہ اس میں سیاست دان، ماہرین لسانیات اور اساتذہ اراکین کے طور پر شامل تھے۔ بظاہر اس کمیٹی کا مقصد بنگالی زبان کو آسان اور سہل بنانے کے لئے مختلف طریقے تلاش کرنا تھا۔ لیکن درحقیقت اس کے ذریعے بنگالی زبان میں ترمیم کرنے اور عربی رسم الخط کی حمایت میں سفارشات منظور کرانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ کمیٹی ۲۱ ماہ تک قائم رہی لیکن یہ مرکزی وزیر فضل الرحمٰن اور ان کے جی حضوری صوبائی سیکرٹری فضل احمد کریم فضلی کی کوئی خدمت انجام نہ دے سکی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ بھی شائع نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہ حکام کی مرضی و منشا کے مطابق نہ تھی۔

زبان کی تحریک خصوصاً اور مشرقی بنگال کے حقوق کی تحریک عمومی اعتبار سے، اس وقت ایک بار پھر اپنے عروج پر پہنچی۔ جبکہ لیاقت علی خان کی قائم کردہ پہلی بنیادی اصولی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی۔ اس میں زبان کے مسئلے کا تذکرہ شامل نہیں تھا۔ لیکن کمیٹی کی دوسری سفارشات پر غور کرنے کے بعد مشرقی بنگال کے عوام نے یہ محسوس کیا کہ ان کی روشنی میں بنگال کے مطالبات پس پشت ڈال دیئے جائیں گے۔ اس رپورٹ کو مشرقی بنگال کے عوام نے قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ لہٰذا حکومت اس رپورٹ کو واپس لینے پر مجبور ہوئی۔ لیکن صورتحال اس وقت بالکل مختلف ہو گئی۔ جبکہ ۱۹۵۲ء میں اس اصولی کمیٹی کی دوسری رپورٹ شائع ہوئی۔

اگرچہ زبان کے سوال پر مستقل خاموشی تھی لیکن طلبہ ہر سال ۱۱ر مارچ ۱۹۴۹ء کی تحریک کی یاد مناتے تھے۔ یہ مسئلہ ۲۶ر جنوری ۱۹۵۲ء کو اس وقت ایک دم آتش فشاں بن کر پھٹ پڑا جبکہ خواجہ ناظم الدین نے جو گورنر جنرل بننے کے بعد لیاقت علی خان کی جگہ وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھے تھے پلٹن میدان میں یہ اعلان کیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہو گی۔ طلبہ جو دوسرے سیاسی مسائل پر منظم ہو چکے تھے، ناظم الدین کے اس اعلان کو لاجواب نہیں رہنے دینا چاہتے تھے۔ کئی دنوں تک احتجاجی جلسے منعقد کئے گئے۔ قومی زبان کی مجلس عمل کو دوبارہ سرگرم کیا گیا۔ ۳۰ر جنوری کو یونیورسٹی کے طلبہ نے مکمل ہڑتال کی۔ جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا۔ اور وسیع بنیادوں پر ایک کل پارٹی مجلس عمل قائم کی گئی۔ تاکہ لسانی تحریک کو پورے زور شور سے چلا سکے۔ مولانا بھاشانی اس کمیٹی کے چیئرمین اور عوامی مسلم لیگ کے ایک رکن قاضی غلام محبوب اس کے کنوینر تھے۔ اس زمانے میں مجیب الرحمٰن ۱۹۴۹ء کی یونیورسٹی کے ملازمین کی ہڑتال کے سلسلے میں جیل میں بند تھے۔

مجلس عمل نے ۲۱ر فروری کو پورے صوبے میں یوم احتجاج منانے کا اعلان کیا۔ اس موقع پر ہڑتال، مظاہروں اور عام جلسوں کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ اس سے قبل یونیورسٹی کی مجلس عمل نے ۴ر فروری کو ڈھاکہ کے تمام تعلیمی اداروں میں ہڑتال کرنے کا اعلان کیا۔ ۴ر فروری کو طلبہ کی یہ ہڑتال زبردست طور پر کامیاب رہی۔ اس کے بعد ۱۱ر اور ۱۲ر فروری کو "فلیگ ڈے" منائے گئے تاکہ ۲۱ر فروری کی ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لئے فنڈز اکٹھے کئے جا سکیں۔

۱۱ر اور ۱۲ر فروری کے ان ایام کی کامیابی

حکومت نے

سازش کو

کامیاب

بنانے کے لئے

مذہب کی

آڑ لی

نورالامین نے خون کی ہولی کو جائز قرار دیا تھا

اور مجلس عمل کے اعلان پر عوام کے زبردست خیر مقدم اور سرگرمی سے گھبرا کر حکومت نے ۲۰ر فروری کی شام کو دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ تاکہ دوسرے روز ہونے والے احتجاجی جلسوں اور مظاہروں کو ناکام بنایا جا سکے۔ مجلس عمل نے اس صورت حال پر غور کرنے کے لئے ۲۰ر فروری کی شام کو ایک ہنگامی اجلاس کیا۔ پرانے اراکین کا خیال تھا کہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ لیکن نوجوان ارکان اور طلبہ کا فیصلہ تھا کہ وہ کمیٹی کے ایسے فیصلے کی پابندی نہیں کریں گے۔ لہٰذا ان کے اسی فیصلے کے مطابق اگلے دن ۱۱ بجے صبح یونیورسٹی کمپاؤنڈ کی حدود میں ایک جلسہ ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ دس دس کی ٹولیوں میں گلیوں میں جلوس نکالا جائے۔ تاکہ ایک طرف دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی جا سکے اور دوسری طرف ہنگامہ آرائی سے بھی پہلو تہی ممکن ہو سکے۔ لیکن یونیورسٹی کمپاؤنڈ میں ابھی جلسہ کی کارروائی جاری تھی کہ باہر کھڑی ہوئی مسلح پولیس کی بھاری جمعیت نے بغیر کسی وجہ کے یونیورسٹی کے اندر جمع طالب علموں پر آنسو گیس کی لوگوں پر بارش کر دی۔ اس غیر ضروری اشتعال انگیز کارروائی کے جواب میں مشتعل طلبہ نے اندر سے پولیس پر پتھراؤ کیا۔ جس کا جواب پولیس نے اس طرح دیا کہ وہ یونیورسٹی کے کمپاؤنڈ کے اندر گھس آئی اور طلبہ پر اس نے زبردستی لاٹھی چارج کیا۔

طلبہ اس عرصے میں پھر بھی پرسکون رہے۔ اور جب پولیس نے اپنی کارروائی سے فارغ ہو کر یونیورسٹی کمپاؤنڈ کو خالی کیا تو انہوں نے اپنے فیصلے کے تحت دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے دس دس کی ٹولیوں میں سڑک پر جلوس نکالا۔ لیکن جیسے ہی یونیورسٹی گیٹ سے دس طلبہ کا پہلا احتجاجی دستہ باہر نکلا تو گیٹ پر کھڑی ہوئی پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور نزدیک کھڑی ہوئی وین میں انہیں بٹھا دیا۔ اس وقت تک احتجاج کی لہر یونیورسٹی سے متصل میڈیکل کالج ہوسٹل اور انجینئرنگ کالج ہوسٹل کمپاؤنڈ میں منتقل ہو چکی تھی۔ ان تمام مقامات پر بغیر کسی وجہ کے پولیس نے طلبہ پر لاٹھی چارج کیا۔ اس کے بعد پولیس کے اس ظلم و تشدد کے خلاف اپنے احتجاج کی آواز پہنچانے طلبہ وزیر اعلیٰ اور صوبائی اسمبلی کے دوسرے اراکین تک جانا چاہتے تھے۔ جو نزدیک ہی اپنے دن کے اجلاس میں شرکت ہونے کے لئے اسمبلی ہاؤس میں جمع تھے۔

لیکن طلبہ جیسے ہی میڈیکل کالج ہوسٹل گیٹ پر جمع ہونا شروع ہوئے اچانک پولیس کی رائفلیں اور بندوقیں بارود اگلنے لگیں۔ سیسہ کی بنی ہوئی سرکاری گولیاں قوم کے ہونہاروں کے سینے چھلنی کرنے لگیں۔ فوری طور پر تین افراد گرے اور انہوں نے دم توڑ دیا۔ شہادت ان کے نام لکھی جا چکی تھی۔ اس اندھا دھند اور بلا وجہ فائرنگ کے بعد طلبہ کے ضبط کا دامن چھٹ گیا۔ زمین ان کے ساتھیوں کے خون سے لالہ زار ہو رہی تھی۔ جذبات کی شدت بڑھی تو ان کے ہاتھوں میں پتھر آ گئے۔ وہ یہ پتھر لئے گلیوں میں نکل آئے۔ پولیس کے شدت پسندوں نے اس کے بعد بھی متعدد راؤنڈ چلائے۔ اس مرتبہ ایم اے سال دوم کا ایک طالبعلم ابوبرکات گولی کا نشانہ بنا۔ وہ ہوسٹل کمپاؤنڈ میں ایک بیرک کے کاریڈور میں کھڑا تھا۔ گولی لگنے کے چند گھنٹوں بعد وہ بھی شہادت کے منصب پر فائز ہو گیا۔

بنگالی زبان کی تحریک کی تشکیل ۱۹۵۶ء میں ہوئی

ابوبرکات کی شہادت کی اطلاع گلی گلی پہنچی تو اس احتجاجی مظاہرہ میں بڑے پیمانے پر عوام کی شرکت ناگزیر ہو گئی۔ اور وہ سب اپنا کاروبار چھوڑ کر طلبہ کے ساتھ ہونے والے اس تشدد کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ یہ اطلاع اسمبلی تک پہنچی تو اراکین اسمبلی ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ اس صورت حال پر بات چیت کے لئے فوری طور پر ایک تحریک التوا پیش کی گئی۔ لیکن اس وقت کے صوبائی وزیر اعلیٰ نورالامین نے پولیس کے اقدام کی حمایت کی اور اسے حق بجانب قرار دیا۔ اس کے رد عمل کے طور پر مسلم لیگ کے دو ارکان اسمبلی نے پارٹی سے استعفیٰ دے دیا جبکہ ایک رکن اسمبلی نے اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا۔

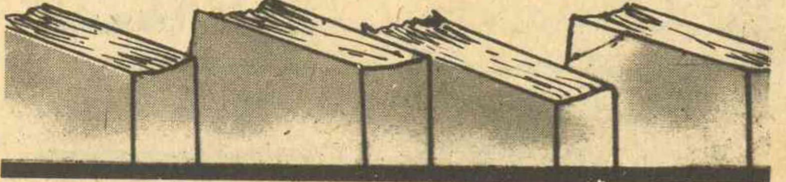
اگلے روز بھی ہڑتال اور احتجاجی مظاہرے جاری رہے۔ غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ پولیس نے اس روز بھی شہر کے مختلف مقامات پر فائرنگ کی جس میں متعدد لوگوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ مشتعل ہجوم نے اس روز ایک انگریزی روزنامے کے دفتر کو آگ لگا دی۔ یہ روزنامہ زبان کے مسئلے پر بنگالی زبان کی تحریک کے خلاف مسلسل اداریئے تحریر کرتا رہا تھا۔ ۲۲ر فروری کو ۳ بجے شام میں اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ اس میں سرکاری اراکین اسمبلی بری طرح بدحواس تھے اور پھر اسی اسمبلی میں اسی روز ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں مرکزی حکومت سے سفارش کی گئی تھی کہ وہ بنگالی کو پاکستان کی ایک قومی زبان قرار دے۔

تحریک نے ایک کامیابی حاصل کر لی تھی لیکن اس کامیابی کے حصول کے لئے سینکڑوں معصوموں نے اپنی متاع جان لٹائی، اپنی زندگی کے چراغ گل کئے اور اپنے لہو سے اس زمین کو لالہ زار کیا۔ جس سے اٹھنے والی سوندھی سوندھی مہک ان کے دلوں میں محبت اور عقیدت کے پھول کھلا دیتی ہے۔ اس سے قبل چار سال تک یہ تحریک پرامن رہی تھی

لہٰذا اس کا کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ حون کی ابتدائی کے دوسرے روز ہی وہ مطالبہ منظور کر لیا گیا۔ جس کے لئے جد و جہد کے کئی طویل اور کٹھن سال گزر چکے تھے لیکن بہرحال نوکر شاہی اور مفاد پرستوں کے گٹھ جوڑ سے کی جانے والی سازش اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

یہ تحریک پورے صوبے میں ۵ مارچ تک جاری رہی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ختم ہو گئی۔ "ٹکنیکی طور پر اس کی تکمیل ۱۹۵۶ء میں ہوئی جبکہ پاکستان کے پہلے دستور میں بنگالی اور اردو دونوں کو پاکستان کی قومی زبانوں کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔

لسانی تحریک کی اس پوری تاریخ قلم بند کرنے کے بعد میرا خیال ہے کہ یہ واضح ہو چکا ہوگا کہ یہ تحریک اردو کے خلاف نہیں تھی۔ اس لئے کہ تحریک کے پورے عرصے میں طلبہ یا مجلس عمل کا مطالبہ محض یہ رہا کہ اردو کے ساتھ بنگالی کو قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ تحریک بنگالی نہ بولنے والوں کے خلاف تھی۔ یہ تحریک ناانصافیوں، استحصال اور جائز حقوق نہ ماننے کے رویہ کے خلاف تھی۔ اور اس تحریک کی کامیابی نے نوکر شاہی اور مفاد پرستوں کی اس سازش کو اس وقت ناکام بنایا جس کا مقصد ایک خطے کے عوام کے زبان و ادب اور ثقافت پر حکمرانی کرنے اور عوام کو ان کے ان قیمتی ورثوں سے علیحدہ رکھنا تھا۔



کتابوں پر تبصرہ

سوشلزم اسلام کی روشنی میں

مصنف : عنایت اطہر

ضخامت : ۱۰۳ صفحات

قیمت : ڈیڑھ روپیہ

طابع : مکتبہ جدید پریس لاہور

عنایت اطہر نے یہ کتاب تصنیف کر کے بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہے۔ قرآن پاک کے حوالوں سے انہوں نے ان شکوک کو رفع کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو سوشلزم کے بارے میں عام لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے کمال غیر جانبداری کے ساتھ قرآنی احکام کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ سوشلزم کسی ڈراؤنی چیز کا نام نہیں بلکہ اصطلاحاً یہ اسی نظام معیشت کا احاطہ کرتا ہے جس کی قرآن مجید میں صراحت کی گئی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں ثابت کیا ہے کہ قرآن پاک اور سوشلزم دونوں عوام کی سربلندی کے خواہاں ہیں۔ اور دونوں مالکانہ، مذہبی اور معاشیاتی استحصال کو ظلم قرار دیتے ہیں۔ سوشلزم سے اللہ کے وجود کا انکار لازم نہیں آتا۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح اس لئے وجود میں آئی کہ قرآنی اصطلاحات دور انحطاط میں اپنی توانائی کھو چکی تھیں۔ کتاب میں واضح کیا گیا ہے کہ جمہوریت اسلام کے اصول مشاورت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور سوشلزم اصول مساوات کی۔ اگر جمہوریت سے اسلام کو خطرہ نہیں تو سوشلزم سے بھی کوئی خطرہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے ایک متمدن سوسائٹی کا جو معیار واضح کیا ہے سوشلزم بھی یہی تصور پیش کرتا ہے۔ بلکہ سوشلزم اس کا ذمہ لیتا ہے کہ کوئی کسی کے آگے دست سوال پھیلانے کا محتاج نہ رہے۔ اگر اسلام ملوکیت کی لعنت میں مبتلا نہ ہو جاتا تو بلاشبہ اسلامی معاشرہ کی صحیح نشوونما جاری رہتی اور اسلامی معاشرہ سے تمام دینی محتاجیاں ختم کر دی گئی ہوتیں، جو انسانی وقار کے منافی ہیں۔ نیز وہ خرابیاں بھی جن کے حوالے دے کر مغربی مصنفین اسلام کو بدنام کرتے ہیں اور ہم تلملا کر ان کتابوں کا اپنے ملک میں داخلہ روک دیتے ہیں۔ یہ کتاب نیوز پرنٹ پر بہت صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔ سوشلزم کو خلاف اسلام سمجھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ (ا - س)

مجھ کو چاہیئے بہار

تصنیف : سید علی

صفحات : ۱۳۶ صفحات

قیمت : ۲ روپے

ملنے کا پتہ : نگارستان پبلشرز

پاکستان چوک - کراچی۔

اس کتاب کو نہ تو ناول کہا جا سکتا ہے اور نہ فلمی کہانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ ناول اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ کہانی کو بیان کرنے کا انداز بہت حد تک فلمی کہانیوں جیسا ہے اور فلمی کہانی اس لئے تصور نہیں کیا جا سکتا کہ انداز بیان میں ناول کی جھلک پائی جاتی ہے۔

● ——— مصنف کہانی کو اس طرح پھیلا بیٹھے جس طرح فلمی کہانیوں کے سکرپٹ لکھے جاتے ہیں کہانی کے مکالموں میں بھی بڑی حد تک فلمی مکالموں کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اور اس کے مقامات، کردار اور لباس میں بھی ڈرامائیت موجود ہے۔ اگر ہم اس کہانی کو ناول کم۔ ڈرامہ کا نام دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔

کتاب کا موضوع بورژوا طبقے کے ان لوگوں کی زندگی ہے جو جائیداد یا دولت والے نہیں ہوتے، اور تاریخ کے دھارے جنہیں مسلسل پستی کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ گر پڑ کر چند نسلوں کے اندر مزدور طبقہ میں جا ملتے ہیں۔ بورژوا طبقے کے یہ گرے ہوئے افراد آخری دم تک کوٹھیوں، کاروں اور بنک بیلنسوں کے خواب دیکھتے رہتے ہیں اور انہیں حاصل کرنے کے جائز و ناجائز طریقے اختیار کرنے کے بارہ میں سوچتے رہتے ہیں مگر قانون کی گرفت میں آنے کے خوف سے عمل نہیں کرتے۔ "مجھ کو چاہیئے بہار" اس خوف کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ (ع - ر)

ترقی پسندی سے موقع پرستی تک

حبیب جالب

بے وقت کی راگنی الاپ رہے ہیں

وقائع نویس

لاہور کے ادبی حلقوں میں "آجکل گکڑ"
کے ادبی انعامات کا بات چرچا ہے
ہر سال جب ادبی انعامات کے نتائج کا اعلان ہوتا ہے تو قہوہ خانوں میں گرمی آ جاتی ہے۔ ادیبوں کی پیالیوں میں طوفان اٹھتے ہیں۔ انعام یافتہ مصنفین کا ادبی پوسٹ مارٹم ہوتا ہے۔ داد بھی ملتی ہے اور بیداد بھی ہوتی ہے۔ فکر بر کس بقدر ہمت اوست! لیکن اس بار دو مصنفین کے نام زیادہ سننے میں آئے! ایک ہیں مشتاق احمد یوسفی جنہیں "حاکم بدہن" پر دس ہزار کا آدم جی ادبی انعام ملا۔ دوسرے ہیں سید سبط حسن جنہیں "ماضی کے مزار" پر صرف ڈھائی ہزار کے داؤد ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

یوسفی کا منصب کچھ بڑھ گیا۔ سبط حسن کا رتبہ کچھ گھٹ گیا۔ اس معاشرے میں سماجی حیثیت کا تعین دولت کے پیمانے سے ہوتا ہے۔ شاید ادبی حیثیت کا تعین بھی اسی پیمانے سے ہوتا ہے یہ بات نہ ہوتی تو سبط حسن اپنا انعام واپس نہ کرتے سچ پوچھئے تو ان کا احتجاج ہے بھی جائز۔ وہ کسی طور یوسفی سے کمتر نہیں۔ دونوں صاحب حیثیت ہیں۔ دونوں پانچ ہزار روپے کمانے والے انکم گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سنا ہے کہ سبط حسن کو سال میں چار بونس بھی ملتے ہیں۔ وہ ڈھائی ہزار روپے کی کب پروا کرتے ہیں۔ اس سے بڑا بونس تو ان کو آئندہ مہینے ملنے والا ہے۔

البتہ سبط حسن نے احتجاج کا طریقہ انوکھا نکالا۔ سارا الزام سیٹھ داؤد کے سر تھوپا اور خود دامن جھاڑ کر صاف الگ ہو گئے۔ حیلہ انہوں نے یہ ڈھونڈا کہ داؤد ادبی انعام میر، غالب یا انیس کے نام پر کیوں نہیں۔ کسی سرمایہ دار کے نام پر ادبی انعام لینا، ادیب کا شیوہ نہیں۔ ادیب کی یہ انا نہ احمد ندیم قاسمی میں پیدا ہوئی۔ نہ شوکت صدیقی میں۔ نہ خدیجہ مستور میں۔ حتیٰ کہ فیض احمد فیض کی انا بھی بیدار نہ ہوئی۔ جو ہر سال آدم جی ادبی انعام کے صرف منصف ہی نہیں بلکہ منصفوں کی سربراہی فرماتے ہیں۔ لاہور کے ادیبوں کا خیال ہے کہ سبط حسن فیض احمد فیض پر چوٹ کر گئے ترقی پسندی میں انہیں مات دے گئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ "نوبل پرائز" جن کے نام پر قائم ہے وہ بھی سویڈن کا ایک بہت بڑا سرمایہ دار تھا شاید یہ بات نوبل کے بارے میں غلط مشہور ہوئی۔ وہ یقیناً کوئی بڑا ادیب، شاعر یا مفکر ہوگا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو سوویت یونین کے ناول نگار میخائیل شلوخوف نوبل پرائز کو اپنی عزت افزائی قرار نہ دیتے۔ اور روسی حکومت انہیں مبارکباد نہ پیش کرتی۔ شاید اس میں یہ نکتہ ہو کہ غیر ملکی سرمایہ دار علم و ادب کا سرپرست بن سکتا ہے۔ اور پاکستانی سرمایہ دار کو یہ حق حاصل نہیں۔ انگریز نے اپنی تین سو سالہ حکمرانی میں ہماری اسی طرح ذہنی تربیت کی ہے۔ ایسا احساس کمتری میں مبتلا کیا کہ سبط حسن اپنی "ترقی پسندی" کے باوجود اس بھنور سے اب تک نہ نکل سکے

غرض کہ اس سارے جھگڑے کی جڑ سرمایہ دار اور سرمایہ داری ہے۔ اور سرمایہ داری نظام کا سب سے موثر حربہ عوام میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرنا ہے مستقبل کے خوف سے ڈراتا ہے۔ زندگی میں عدم تحفظ کا احساس جتنا شدید ہوتا ہے، مستقبل کی فکر اتنی ہی زیادہ دامن گیر ہوتی ہے۔ آدمی، آدمی سے جدا ہو جاتا ہے۔ معاشرے سے کٹ جاتا ہے۔ خود غرض بن جاتا ہے۔ اپنا سماجی دائرہ تنگ سے تنگ کر لیتا ہے۔ اس دائرے میں اس کی ذات صرف اس کے متعلقین تک محدود ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے خول میں سمٹتا جاتا ہے۔ اس کے گرد حصار قائم کر لیتا ہے۔ فصیلیں بناتا ہے۔ اور ان کے استحکام کے لئے تحفظات تلاش کرتا ہے سرمایہ داری نظام جو تحفظات مہیا کرتا ہے ان میں زندگی کا بیمہ کرانا سر فہرست ہے۔ سید سبط حسن ایسٹرن فیڈرل یونین کے شعبۂ نشر و اشاعت کے سربراہ ہیں۔ اس انشورنس کمپنی کے مالک مختار عباس خلیلی ہیں۔ جو ۲۲ خاندانوں کی اس مشہور فہرست میں شامل ہیں جن میں سیٹھ داؤد بھی ہیں۔ اور آدم جی بھی۔ معلوم نہیں ان بائیس خاندانوں میں سے کسی کا سرمایہ ادیب پر واجب ہے۔ کس کا غیر واجب۔ کس کا جائز ہے کس کا ناجائز۔

کیا سرمایہ داری چند افراد کا نام ہے؟ کیا سرمایہ داری نظام چند ناموں سے عبارت ہے؟ غالباً سبط حسن اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ حبیب جالب بھی جو یہ ہے کہ قریہ قریہ، نگری نگری ادبی انعامات کے خلاف ڈھول پیٹتے پھرتے ہیں۔ ایوب خاں ختم ہو گیا وہ ابھی تک اس کے سائے کو پیٹ رہے ہیں۔ حبیب جالب ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں طبقاتی شعور نہیں۔ انہیں یہ علم نہیں کہ ہر عوامی جدوجہد، طبقاتی جدوجہد ہوتی ہے۔ یہ جدوجہد افراد کے خلاف نہیں، طبقات کے خلاف ہوتی ہے۔ سیاسی شعور کی یہی وہ کج روی تھی جس نے پچھلی عوامی جدوجہد کو ناکام بنا دیا۔ اس کا رخ استحصالی طبقات کے بجائے ایوب خاں اور صرف ایوب خاں کی طرف موڑ دیا۔ یہ نہ سوچا کہ افراد کے عروج و زوال سے طبقات کا عروج و زوال نہیں ہوتا۔ افراد آتے ہیں، افراد چلے جاتے ہیں نئے چہرے پرانے چہروں کی جگہ لے لیتے ہیں۔ شیکسپیئر نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ صرف نام میں کیا رکھا ہے۔

مجیب الرحمٰن کو "الوٹ انگ" ہو گیا ہے

نمائندہ خصوصی —— لاہور

مزدوروں کے ہفتہ مطالبات نے لاہور کی سڑکوں کو سرخ جھنڈوں سے گلنار کر دیا ہے۔ نواحی بستیوں کے مزدوروں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ جھگڑا چھ یا سات نکات کا نہیں، روٹی کا ہے۔ روٹی جس نے دنیا کے عظیم انقلابات کو جنم دیا۔ اور جب تک روٹی کا جھگڑا باقی ہے، انقلابات اگتے رہیں گے۔ اس لئے کہ بھوک کا پودا —— جب پھل دینے پر آتا ہے تو وہ انقلاب اور تبدیلی کے سوا کچھ پیدا نہیں کرتا۔ دنیا بھر کی تاریخ اس اصول کی تشریح کے سوا کچھ بھی نہیں ...... ہے

جو نہ سمجھے وہ اناڑی ہے

تاریخ و معاشیات کے ایک بڑے عالم نے ۱۸۴۸ء کے لگ بھگ یورپ میں مزدوروں کی جدوجہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ...... سرمایہ داری نہ صرف ان مشینوں کو جمع کرتی ہے جن سے پیداوار ہوتی ہے بلکہ وہ ان ہاتھوں کو بھی جمع کرتی ہے جو بالآخر اس ظالمانہ نظام کا گلا گھونٹ دیں گے....

پہلا جلوس شاہدرہ انڈسٹریل ایریا سے نکلا۔ جو تقریباً پانچ گھنٹے جاری رہا۔ اس جلوس کی قیادت شاہدرہ کے مزدور کر رہے تھے۔ ٹیکسٹائل یونین کے عبدالحمید بٹ نے (جو اس یونین کے صدر ہیں) سر پر سرخ ٹوپی پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھ میں سرخ جھنڈا تھا۔ ان کے پیچھے سرخ جھنڈوں کا ایک دریا بہتا چلا آ رہا تھا۔ اس جلوس میں بشیر بختیار بھی تھے ان کی گرتی ہوئی صحت نے انہیں اگرچہ جلسے جلوس کے قابل نہیں رکھا۔ مگر پھر بھی گذشتہ روز انہوں نے شاہدرہ کے ایک کارخانہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا —— پاکستان میں سرخ اندھیری آ رہی ہے۔!

اگر اخبارات کی رپورٹنگ درست ہے لفظ "اندھیری" قابل غور ہے۔ شاید جوش جذبات میں البتہ کہہ دیا ہو —— ورنہ یہ لفظ کوئی بھی مزدور دوست استعمال نہیں کر سکتا۔ مزدور اور کسان "اندھیری" نہیں "سویرا" لائیں گے —— رنگ وہی ہو گا البتہ۔!

○

گنگا کے دھاکے کے بعد جنتا کی وادی سے جو آواز آتی ہے وہ ہے مسز اندرا گاندھی کی دھمکیاں —— ان دھمکیوں نے لاہور کی فضاؤں میں جوابی دھماکے پیدا کر دیئے ہیں۔ پھر شیخ صاحب قبلہ نے ڈھاکہ منڈی سے ایک "دھمکا" بھی جاری فرمایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حریت پسند جو جہاز لاہور لائے تھے وہ چھ نکات کی "نکاتی" کرنے کے لئے لائے تھے۔ اور جو کھیر اب پک کر تیار ہوئی ہے، کشمیری حریت پسندوں نے اس میں نمک شامل کر دیا ہے۔ .... پاکستان کے متوقع وزیر اعظم کا فرمان ہے کہ یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟ روسی امریکی ٹوڈی کے پروگرام کے تحت چھ نکات کی بنیاد پر ملکی سیاست میں شدید بحران پیدا کرنا کیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو اتنی بھاری اکثریت کے باوجود شیخ مجیب الرحمٰن صاحب الیکشن کے بعد اب تک پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے دورے پر تشریف کیوں نہیں لاتے؟ آخر سازش ہے کس بلا کا نام .....؟ بنگال کا لیڈر اتنی بڑی کامیابی کے باوجود ملک کے اس حصہ میں لینے والوں سے شاکی کیوں ہے؟

○

لاہور کے دانشور حلقوں میں بھٹو صاحب کے اس بیان پر کہ وہ اس وقت تک قومی اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں شامل نہیں ہوں گے، جب تک مجیب الرحمٰن چھ نکات پر اڑے ہوئے ہیں۔ مختلف آراء کا اظہار ہو رہا ہے۔ عام رائے یہ ہے کہ مجیب صاحب کو بھی "الوٹ انگ" ہو گیا ہے۔ اور ان کی حالت لالہ جی کے اس لڑکے کی سی ہے جو اپنے مدمقابل کی پشت پر چڑھا بیٹھا تھا۔ اور زار و قطار رو رہا تھا۔ جب کسی نے پوچھا کہ اس وقت تو تم "سوار" ہو اور مخالف گرا ہے تو روتے کیوں ہو —— اس لالہ کے لڑکے نے جواب دیا تھا —— "اور اگر یہ اوپر آ گیا تو مجھے کون چھڑائے گا..... ہوں ہوں ..... ہائے رام میں کا کروں ——" اور بھٹو صاحب کا بیان عام طور پر پسند کیا جا رہا ہے۔ آگے دیکھئے کیا ہو ..... پارلیمانی جمہوریت کا چراغ آندھیوں کی زد میں ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے پاکستان میں پارلیمانی طریقہ کار نہ لوٹا تو اس کی ذمہ دار جناب شیخ مجیب پر ہو گی —— "علیحدگی" ایک دیوانے کا خواب ہے۔ کوئی قوم اپنے حصے بخرے ہوتے نہیں دیکھ سکتی —— بالخصوص عوام کے محب وطن ہونے میں کسی کو شک نہیں۔ ویسے بھی ۷ دسمبر سے پہلے یحیٰی خاں کہہ چکے ہیں کہ جو لوگ لیگل فریم آرڈر کی حدبندیوں کو قبول نہیں کریں گے۔ ان کے متعلق (خواہ وہ کتنی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوتے ہوں) فرض کیا جائے گا کہ انہوں نے انتخاب نہیں لڑا —— ! یہ وہ عام رائے ہے جو ہر جگہ پائی جا رہی ہے۔

○

اتوار ۱۵ فروری کو "یبرہال" میں آغا نعیم اللہ شہید ڈے منایا گیا۔ آغا نعیم اللہ شہید نے ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اپنے امنگوں سے بھرے جوان سینے پر گولی کھائی تھی۔ اور یوں پاکستان کی انقلابی تاریخ میں ایک اور نوجوان کے نام کا اضافہ ہوا تھا۔ نوائے طلباء اس لحاظ سے مبارک باد کی مستحق ہے کہ ایک محنت کش کے بیٹے کو منظر عام پر لانے کی سعی کی گئی ورنہ اکثر ہوتا یوں ہے کہ جان سپاہی دیتے ہیں اور تاریخ "جنرل" کے کارنامے گنواتی ہے۔ اب تاریخ کے لکھنے والوں کو انداز تحریر بدلنا ہو گا۔ گمنام شہیدوں کو مزید گمنام نہیں رہنے

دیا جائے گا۔ حسن ناصر کی روایت کو زندہ رکھنے والے اب گمنامی کے اندھیروں میں دفن نہیں ہوں گے۔ محنت کش طبقہ اپنے محسنوں کو فراموش نہیں کرے گا۔

اس اجتماع میں این ایس او کے لوگ بھی شامل تھے۔ امتیاز عالم نے اپنی تنظیم کی طرف سے آغا نعیم اللہ شہید کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ نوائے طلبا کے جنرل سیکرٹری علامہ صدیق اظہر نے اپنی تنظیم طرف سے اس عزم کا اظہار کیا کہ پاکستان میں مزدور کسان راج کے قیام کے لئے طلبا مسلسل قربانیاں دیتے رہے ہیں اور طلوع سحر تک دیتے رہیں گے۔ اس موقع پر انہوں نے دیگر شہید طلبا کی قربانیوں کا ذکر بھی کیا اور خراج تحسین پیش کیا۔

شہیدوں کے مزار پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

نواب اکبر کی سیاست کس رُخ پر جارہی ہے

محمود مری بلوچ — کوئٹہ

شیخ مجیب اور نواب اکبر خان کی بات چیت کو ملک میں جو سیاسی اہمیت دی گئی ہے، بلوچستان میں اس کو سیاسی طور پر ویسی اہمیت نہیں دی جارہی ہے۔ بلوچستان کے سیاسی اور واقف حال حلقے ان مذاکرات کے پس منظر میں البتہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان مذاکرات کے نتیجہ میں اس بلوچستان کے سیاسی مبصروں میں دو اہم سوال زیر بحث ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا نواب اکبر خان نے بحیثیت بلوچستان کی اکثریتی جماعت کے نمائندہ کے مجیب صاحب سے آئینی اور سیاسی معاملات پر بات چیت کی۔ اور انہیں حمایت کا یقین دلایا؟ اور یا پھر شیخ مجیب نے نواب اکبر خاں کو کسی اور حیثیت میں پذیرائی بخشی ہے؟ جہاں تک نواب اکبر خاں کے بلوچستان کی اکثریتی جماعت کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے مجیب صاحب سے بات چیت کا تعلق ہے تو یہ واضح ہے کہ نواب موصوف خود روانگی سے واپسی تک یہی تاثر دینے کی کوشش کرتے رہے اور یقین دہانیاں کراتے وقت انہیں بلوچستان سے منسوب کرتے رہے۔ پھر یہی تاثر غالباً پاکستان کے سیاسی حلقوں اور اخبارات نے بھی قائم کیا۔ چنانچہ معاصر "آزاد" اپنے پندرہ روزی کے ادارتی کالموں میں یوں لکھتے ہیں۔ "دوسری جانب شیخ مجیب الرحمٰن اور نیپ (ولی گروپ) کے درمیان بھی بات چیت کے ذریعہ مفاہمت ہوگئی"۔ اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس وقت آئینی معاملات میں بلوچستان کی نمائندگی کا حق نیپ کو ہی پہنچتا ہے۔ لیکن یہ سوال حل طلب ہے کہ آیا نواب اکبر خاں نیپ کے نمائندہ کی حیثیت سے ڈھاکہ گئے؟ اور انہیں بات چیت کے لئے نیپ نے مجاز و مختار قرار دیا ہے یا صورتحال کچھ مختلف ہے!

سیاسی مبصرین کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ انہیں نیشنل عوامی پارٹی کی حمایت حاصل ہے۔ وہ ان کے صلح مشورے ہی سے ڈھاکہ گئے اور جس انداز میں انہیں مختار و مجاز قرار دیا گیا اسی انداز میں انہوں نے بات چیت کی۔ اگر اس امکان کو درست بھی تسلیم کیا جائے تو بھی یہ امر یقینی ہے کہ انہوں نے کسی باقاعدہ اجلاس میں نہ تو یہ اسکیم پیش کی اور نہ ہی منظوری حاصل کی۔ البتہ اپنے گروہ کے کچھ ممبوں میں سے کسی سے ٹیلیفونوں پر کسی سے راستہ چلتے ہوئے، اور کسی سے ذاتی دعوتوں میں اپنے فیصلے کی توثیق کرالی۔ جیسے کہ ماضی میں وہ کرتے رہے ہیں۔ ایسی حالت میں سیاسی حلقے اس خدشہ کا بھی اظہار کررہے ہیں کہ آیا نیشنل عوامی پارٹی اپنی موجودہ حیثیت برقرار رکھے گی یا بلوچستان کی سطح تک عوامی لیگ میں ضم ہوجائے گی؟

جہاں تک پورے سوال کا تعلق ہے اس وقت تک اس بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔ بہرحال اس امکان کو بھی رد نہیں کیا جاسکتا کہ مجیب صاحب سے بات چیت کے دوران میں لازمی طور پر بلوچستان میں عوامی لیگ کی تنظیم نو زیر بحث آئی ہوگی۔ اور جس میں نواب صاحب اور شیخ صاحب نے اپنے اپنے طور پر دبے لفظوں میں اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہوگا کہ بلوچستان میں نیشنل عوامی پارٹی کو جس صورت میں کہ دونوں جماعتوں کے تمام گروپ (نیپ ولی بلوچستان کی حد تک) یکساں ہیں۔ اکثریتی پارٹی عوامی لیگ میں ضم ہونا چاہیئے۔ اس امکان کو اس بات مزید تقویت ملتی ہے، کہ انتخابات کے بعد سے نواب اکبر گروہ کی پروپیگنڈہ مشنری نے نیپ سرحد کے خلاف اپنا پروپیگنڈہ تیز کردیا تھا۔ اور کہا یہ جاتا رہا کہ جب سرحد میں نیپ صرف تین نشستیں حاصل کرکے شکست فاش سے دوچار ہوئی ہے اس کے برعکس بلوچستان میں تین نشستیں حاصل کرکے اس نے عظیم کامیابی حاصل کی ہے تو اس کی قیادت بلوچستان کو حاصل ہونا چاہیئے۔

نواب موصوف جب ڈھاکہ پہنچے اسی دن ان کے ایک ساتھی کا بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ بلوچستان سے خاتون ممبر کی مخصوص نشست کے لئے ٹکٹ بنگال کی کسی خاتون کو دیا جائے۔ یاد رہے کہ نیشنل عوامی پارٹی کے بائیں بازو نے اس تجویز کو مکمل طور پر رد کردیا ہے کہ اس نشست کے لئے بلوچستان سے باہر کسی خاتون کو ٹکٹ دیا جائے اور اس میں بائیں بازو کی کامیابی یقینی امر ہے۔ مبصرین کے دوسرے گروہ کا خیال یہ ہے کہ نہ صرف نواب اکبر نیشنل عوامی پارٹی کی نمائندگی نہیں کررہے ہیں بلکہ نیشنل عوامی پارٹی نے بائیں بازو کے عنصر کے دباؤ سے مجبور ہوکر نواب اکبر خان کو واضح طور پر ہدایت کی ہے کہ اگر وہ ڈھاکہ جارہے ہیں تو ذاتی حیثیت سے اور کہ وہ جو گفت وشنید کریں، ان کی نیشنل عوامی پارٹی پابند نہ ہوگی۔ نواب اکبر خان کو یہاں تک کہا گیا کہ وہ کسی بھی مرحلے پر نیشنل عوامی پارٹی کے ترجمان کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش نہیں کریں گے۔ چنانچہ انہیں حلقوں کا استدلال ہے کہ روانگی سے واپسی تک انہوں نے نیشنل عوامی پارٹی کا نام استعمال نہیں کیا۔ اس کا مزید ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ گذشتہ دنوں پارٹی کے پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس کے دوران جب دائیں بائیں بازوؤں کی کشمکش میں بائیں بازو کا پلہ بھاری رہا

اور نواب اکبر خاں نے رجعت پسندانہ ردعمل کے طور پر دو مقننہ ایوان کے فیصلہ کو سبوتاژ کرنے کی ناکام کوشش کی تو اس کے نتیجہ میں نہ صرف نیشنل عوامی پارٹی کو اپنے موقف کے بارے میں وضاحت کرنی پڑی بلکہ نواب صاحب کو اپنے دائیں بازو کے عنصر کا حکومت بنانے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتے نظر نہیں آتا اور اس باب میں بائیں بازو کے فتح کے امکانات روشن ہوتے جارہے ہیں۔

پارٹی کی سطح پر شکست اور اس طرز عمل کے بعد سے نواب اکبر خاں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ایک طرف تو پارٹی پر دباؤ ڈالا جاسکے، اور دوسری طرف وہ اپنے آپ کو بلوچستان کا واحد رہنما ثابت کرکے ذاتی مفادات کے لئے راستہ ہموار کرنے میں کامیاب ہوسکیں۔ چنانچہ اسی منزل کو طے کرنے کے لئے انہیں عوامی لیگ بلوچستان کے صدر کی رفاقت بھی حاصل ہوئی جو ہمیں خود فریبی میں مبتلا ہوکر ڈھاکہ کا طواف کر رہے ہیں کہ نواب اکبر خان کے لئے گورنری اور اپنے لئے میر خیر بخش کے خالی کردہ قومی اسمبلی کی نشست پر امیدواری کا ٹکٹ شیخ مجیب سے حاصل کرلیں گے

بقیہ: صدر نکسن

خریدار ہوگا اور تمام صوبے بلاحیل و حجت یہ نوٹ بیچنے پر مجبور ہوں گے۔ پاکستان کی اساس چونکہ فی الوقت سرمایہ دارانہ نظام ہی پر ہے۔ اس لئے وہ امریکہ کے حلقہ اثر کو توڑ کر کسی اور سمت دیکھ ہی نہیں سکے گا۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ غیر ملکی امداد کی شق فروری ۱۹۶۶ء میں چھ نکات میں شامل نہیں تھی۔ یہ شق جون ۱۹۷۰ء میں شامل کی گئی ہے جب کہ عوامی لیگ کا انتخابی منشور تیار کیا گیا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں عالمی بنک کے ایک ڈائریکٹر مسٹر وڈز پاکستان آئے تھے۔ اور انھوں نے ڈھاکہ میں روٹری کلب کے ڈنر میں تقریر کرتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ کہا تھا کہ آئندہ امداد مشرقی پاکستان کو الگ سے دی جانی چاہیے۔ کیونکہ مرکزی حکومت اس امداد کو صحیح طور پر استعمال نہیں کر رہی ہے اور پھر بعد میں عالمی بنک کے کنسورشیم اور بین الاقوامی مالیاتی فنڈ نے پاکستان کو امداد دینی بند کر دی۔ جواب تک بند ہے۔

اسی دوران میں لاکھوں ڈالر سیلاب زدگان کی امداد کے لئے نہیں بلکہ سیلاب پر قابو پانے کے بہانے مشرقی پاکستان کو دے دیئے گئے۔ چھ نکات کی یہ شق آگے چل کر کیا گل کھلائے گی اس کا اندازہ ابھی سے لگایا جاسکتا ہے۔ مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ امریکہ کی "غیر جانبدارانہ" ہمدردی کے جال کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ اب جونکسن صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ امریکہ برصغیر میں فنی تکنیکی امداد کے پروگراموں پر عمل کرتا رہے گا۔ تو سب کو خبردار رہنا چاہیئے کہ فنی تیکنیکی امداد پاکستان کے لئے کچھ اور ہوگی اور بھارت کے لئے کچھ اور۔ اس قسم کی اصطلاحات کے پردے میں امریکہ ڈلس صاحب کے زمانے سے پاکستانیوں کو بہکاتا آیا ہے۔ اب جو سیاسی موسم بدلا ہے تو اس موقعے پر نکسن صاحب کا یہ انتباہ کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان مستقل اختلافات کی وجہ سے یہ علاقہ غیر ملکی اثرات کی اماجگاہ بن سکتا ہے۔ اپنے اندر بہت کچھ معنی رکھتا ہے۔

بقیہ: ظاہری خبریں اندرونی کہانیاں

خاندانوں یا ان کے حواری نوکرشاہی اور دوسرے مفاد پرست طبقوں کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ مگر مزدور کسان اور محنت کش اقتصادی طور پر بالکل کچلے جاچکے ہیں۔ پیپلز پارٹی کو عوامی سطح پر ان لوگوں کے مسائل کا حل ڈھونڈنا ہے۔ یہ لوگ آخر کب تک اس تسلی میں رہیں گے کہ عوامی حکومتیں آئیں تو ان کے مسائل حل ہوں گے۔ عوامی حکومتوں کا قیام تو روز بروز دور ہوتا جارہا ہے۔ پیپلز پارٹی کو اپنے وسائل مجتمع کرکے ایسی اجتماعی سکیمیں بنانی چاہئیں جن سے زیادہ پریشان حال لوگوں کے مسائل کسی حد تک حل ہوسکیں۔ صدر یحیٰی کو چاہیئے کہ صوبائی حکومتوں کا نظم و نسق کم از کم ان پارٹیوں کے حوالے کر دیا جائے جو وہاں اکثریت میں ہیں۔ ان سے عوام کی پریشانیوں میں خاطر خواہ فرق پڑ سکتا ہے۔ ورنہ حالات اور خراب ہونے کا خطرہ ہے۔

جدوجہد کا نیا دَور

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

آئندہ شمارہ بڑے سائز پر شائع ہوگا

- سرورق رنگین ——— اور موجودہ مستقل عنوانات کے علاوہ
- الفتح انکشافات ، ظلم وتشدّد کی سچی کہانیاں

ابراہیم جلیس ، شوکت صدیقی ، صفدر میر ، سابق ایئرکموڈور ایم کے جنجوعہ
افضل صدیقی (سابق نیوز ایڈیٹر جنگ)، منہاج برنا (سیکرٹری جنرل انجمن صحافیان پاکستان)
اور ——— محمود شام

ہر ہفتے سیاسی اور بین الاقوامی حالات پر لکھیں گے

'الفتح' کے نئے دَور میں ثقافت، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور کھیل کی دنیا بھی شامل ہوں گے

سائز: ——— ۱۲" × ۹"

قیمت یہی رہے گی

*

موجودہ سائز میں تبدیلی سے نو صفحات کا اضافہ ہوگا

*

مشتہرین اور ایجنٹ حضرات رجوع کریں

جنرل مینیجر ہفت روزہ الفتح ۲۹ ، ۸۷-ڈی- نرسری کمرشیل ایریا، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
4 — 11 MARCH, 1971